

بہارِ مہمان



بہارِ مہمان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

اہتمام اشاعت — محمد سلیم رفائی

بار اول — ۲۰۰۱ء

مطبع — یو این ڈی پرنٹرز لاہور

قیمت — ۱۰۰/- روپے

جلوہ نمائی

جلوہ نمائی کی بات چلے تو ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے اپنی اپنی محبت کا چہرہ روشن ہو جاتا ہے۔ پیاسی آنکھیں بار بار اس پردے کو بھتی ہیں جہاں چاند جھلک دکھا کر چھپ گیا ہے۔ چاند بھی خوب سمجھتا ہے کہ چھپ چھپ کر سامنے آئے گا تو اس کی قدر و قیمت بڑھ جائے گی۔

ISBN 969-517-027-7

اے، جی خسرو نے چیخے چیخے ڈانس پر ایک زوردار گھونسا مارا۔ اس کے ساتھ ہی ڈانس پر رکھا ہوا مانگ لڑ گیا۔ اس کے تار یا دھر اُدھر ہو گئے۔ دور دور تک تالیوں کا شور کو بجے لگا۔ اسٹیج پر کھڑے ہوئے ایک سیاسی ورکر نے زور کا نعرو لگایا۔ ”نعرو بکیر؟“
 حاضرین جلسہ نے پورے جوش و خروش سے کہا۔ ”اللہ اکبر۔“
 پھر سیاسی ورکر نے سوال کیا۔ ”پاکستان؟“
 حاضرین جلسہ نے وہی رٹا رٹایا جواب دیا۔ ”زندہ باد۔“

اسی طرح خڑے بازیاں ہوتی رہیں۔ پھر اے، جی خسرو نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر حاضرین جلسہ سے خاموش رہنے کی درخواست کی اور کہا۔ ”میرے بزرگو! میرے بھائیو! ہم نے پاکستان میں اٹھائیں برس تک زندہ باد کے نعرو لگاتے لگاتے اپنے قیمتی وقت کو مردہ باد کر دیا۔ یہ غور کرنے کا مقام ہے۔ ہم زندہ باد اسی وقت ہو سکتے ہیں جب ہم عمل طور پر کچھ دکھائیں۔ اس حکومت نے روٹی، کپڑا مکان کا نعرو لگایا تھا لیکن آج بھی ہم بے مکان، بے سروسامان ہیں۔ میں آپ سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کروں گا جسے پورا نہ کر سکوں۔ میں آپ کے لئے نیند کی گولیاں لے کر نہیں آیا ہوں۔ میں آپ کو سانسے خواب نہیں دکھاؤں گا۔ میں عمل کی دعوت دینے آیا ہوں۔ وہ عمل کیا ہے؟ اس سے پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ یہ حکومت منگائی بڑھائی ہے تو آپ اس منگائی کو خوش آمدید کیوں کہتے ہیں؟

میرے بزرگو! میرے بھائیو! میرے دوستو! جب ہم آپ کے دونوں سے اقتدار حاصل کریں گے تو منگائی بڑھانے والوں کا محاسبہ کریں گے لیکن ابھی ہم آپ کا محاسبہ کرتے ہیں۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے۔ اگر آپ لوگ سگریٹ نہ پکھن تو دکانوں میں سگریٹ نظر نہ آئیں۔ اگر آپ شراب نہ پکھن تو یہ جگہ جگہ کھلے ہوئے بار بند ہو جائیں۔

چلے، شراب کا تعلق عوام سے نہیں ہے۔ اسے نفع کے عادی لوگ پیتے ہیں لیکن سگریٹ پینے والوں کی اکثریت ہے۔ ہم یہ سوچیں کہ ہماری زندگی کے لئے لازمی خوراک یا ہماری لازمی ضرورت کیا ہے؟

گوشت کھانا ہمارے لئے لازمی نہیں ہے۔ ہم اس کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں لیکن آپ آئے دن دیکھتے رہتے ہیں کہ گوشت کی دکانوں میں سب سے زیادہ بھیڑ ہوتی ہے۔ پہلے گائے کا گوشت صرف چھ روپے میر لٹا تھا اور بکے کا گوشت گیارہ اور بارہ روپے میر لٹا تھا۔ آج بکے کا گوشت سولہ روپے میر ہے اور گائے کا گوشت دس روپے۔ اگر آپ کی خریداری کا یہی عالم رہا تو آئندہ چھ برسوں میں یہی گوشت تیس روپے اور بچاس روپے میر کے صلب سے ملے گا اور تب بھی آپ اسی جوش و خروش سے 'اسی شوق سے' خرید کر کھائیں گے اور ماتم کریں گے کہ منگائی بڑھتی جا رہی ہے۔

آپ یقین کریں کہ منگائی کو آگے بڑھنے کا حوصلہ ہم اور آپ دیتے ہیں۔ دکاندار تو محض ایک ریٹ مقرر کرتا ہے اور چپ چاپ بیٹھا دیکھتا ہے کہ موجودہ ریٹ پر خریدنے والے کتنے ہیں۔ جب خریداروں کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے تو وہ اس چیز کو بازار سے غائب کر دیتا ہے۔ پھر کہیں کہیں دکانوں پر پہنچاتا ہے تاکہ وہ چیز بلیک میں فروخت ہو سکے۔ جب لوگ بلیک میں خریدنے لگتے ہیں تب اچانک وہی چیز اپنی بڑھی ہوئی قیمت کے ساتھ بازار میں پہنچ جاتی ہے اور آپ لوگ اسی منگائی کے ساتھ اسے قبول کر لیتے ہیں۔

آج جبکہ ہم سب اپنا اپنا عاسبہ کر رہے ہیں تو ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہم جان بوجھ کر ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ہماری کون سی کمزوری آڑے آتی ہے؟ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی چیز کی بھی جلو نمائی آدمی کو بے خود کر دیتی ہے۔ ایک چیز جلو دکھا کر چھپ جائے تو تڑپا کر رکھ دیتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کو ہر قیمت پر پھر دیکھیں۔ پھر اس نقادے سے لطف اندوز ہوں۔ کاروبار کرنے والے انسانی نفسیات کو خوب سمجھتے ہیں۔ اسی لئے سگریٹ ہوں یا گوشت، پہلے وہ آپ کی زبان پر چکا لگاتے ہیں۔ اسے بازار میں دکھاتے ہیں پھر چھپاتے ہیں۔ چھپا کر اس کا بھاؤ بڑھاتے ہیں 'اور جب آپ کی تڑپ' آپ کی بے چینی اسے ہر قیمت پر قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے تو وہی چیز جلو نما

ہو جاتی ہے اور آپ ایک عاشق زار کی طرح اسے ہر قیمت پر گلے لگا لیتے ہیں۔ "اے 'جی خسرو نے' رائس پر پھر گھونٹہ مارتے ہوئے پوچھا۔ "میں پوچھتا ہوں۔ کیا ایسے وقت ہم سب عقل سے خالی ہو جاتے ہیں؟ ہم سمجھ بوجھ سے کام نہیں لے سکتے؟ میں آپ سے ایک اخلاقی سوال کرتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے اس جلسے میں کوئی خوبصورت لڑکی جلو نمائی کے سازو سامان سے آراستہ ہو کر آجائے تو کیا ہم اس کے دیوانے ہو جائیں گے؟ اور پھر وہ چھپ جائے تو کیا اسے ہر قیمت پر دیکھنے کی ضد کریں گے؟"

اس کا سوال پورا ہو گیا۔ وہ جواب بن کر آگئی پہلے تو پتہ نہ چلا کہ کہیں سے آگئی، کیسے آگئی۔ بس یوں لگا جیسے سیدھی آسمان سے اتر کر شامیانے کو چھید کر جلسہ گاہ میں پہنچ گئی ہو۔ اسے دیکھتے ہی اے 'جی خسرو کی تقریر ٹھٹھک کر رہ گئی۔

اب وہ اتنی حسین بھی نہیں تھی کہ کوئی اس کے لئے اپنا تخت چھوڑ دیتا اور اپنا تاج اس کے قدموں پر رکھ دیتا۔ بس وہ حسین تھی اور اے 'جی خسرو کسی کے حسن سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔ اس نے ٹھٹھک جانے والی تقریر کو دھکا دے کر آگے بڑھایا۔ "ہاں تو میرے بڑے گوا! میرے بھائیو! میرے دوستو! میں کہہ رہا تھا میں کہہ رہا تھا..... ہاں کہہ رہا تھا کہ منگائی، اس منگائی کا مقابلہ ہم کر سکتے ہیں۔ اگر آپ میرا ساتھ دیں تو ہم چند بنٹوں میں یا چند مہینوں میں اس منگائی کا منہ توڑ جواب دیں گے اور اسے بیش کے لئے ختم کر دیں گے۔"

حاضرین بیک وقت کہنے لگے۔ "ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ منگائی کو ختم کرنے کے لئے ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔"

اس شور و غل میں اے 'جی خسرو نے دیکھا۔ وہ اسٹیج کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے چھوٹے سے کمرے کو اپنی آنکھ سے لگایا۔ پھر ایک آنکھ دہائی اور اے 'جی خسرو کی تصویر امار لہ۔ خسرو ایک دم سے چونک گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ شیرو نے آنکھ ماری ہو۔ پھر دماغ نے سمجھایا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کمرے سے تصویر اتارنے وقت ایک آنکھ عموماً دہائی جاتی ہے اور دوسری آنکھ سے تصویر کی فریمنگ کی جاتی ہے تب اسٹیپ لیا جاتا ہے۔ وہ شیرو نے اسی لئے آنکھ دہائی تھی لیکن دل نے کہا 'لڑکی نے آنکھ ماری ہے اور وہ دیکھو'

تصویر اتارنے کے بعد دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔

ایک دم سے دماغ میں بات آئی کہ یہ اپوزیشن پارٹی والوں کی شرارت ہے۔ انہوں نے اسے ہوت کرنے کے لئے ایک لڑکی کو پریس فوٹو گراف بنا کر بھیجا ہے تاکہ ہم کوئی اعتراض نہ کر سکیں۔ حاضرین مختلف نعرے لگانے کے بعد خاموش ہو گئے تھے۔ اسے 'جی خسرو نے کہا۔ "میں نے ایک منصوبہ بنایا ہے۔ ہم سب مل کر ایک تحریک چلائیں گے جس طرح ہفتہ صفائی اور ہفتہ بچت وغیرہ کی تحریکیں چلتی ہیں اسی طرح ہم ایک ماہ تک 'ہونگائی ٹھاہ' کی تحریک چلائیں گے۔"

ایک سہمی چہچہے نے اسٹیج پر سے نعرہ لگایا۔ "بولو بولو ہونگائی ٹھاہ۔"

تمام حاضرین نعرے لگانے لگے۔ "ہونگائی ٹھاہ، ہونگائی ٹھاہ۔"

وہ دو شیئر اب اسٹیج کے دوسری طرف جا کر دوسرے ڈاویے سے اس کی تصویر اتار رہی تھی۔ خسرو نے ڈائس کی طرف سے پلٹ کر اپنے پیچھے کرسی پر بیٹھے ہوئے اپنے پارٹی سیکرٹری سے کہا۔ "ذرا اس لڑکی کو دیکھنا کہیں وہ اپوزیشن پارٹی سے تعلق نہ رکھتی ہو۔" پارٹی کے جنرل سیکرٹری نے اس دو شیئر کی طرف دیکھ کر مسکرا کر کہا۔ "میں خسرو صاحب! وہ شینہ ہے۔ شینہ درانی۔ ہمارے افضل احمد درانی صاحب کی صاحبزادی ہے۔ آج کل روزنامہ اتحاد سے منسلک ہے۔ اسی اخبار کے لئے آپ کی تصویریں اتار رہی ہے۔ آپ اطمینان رکھیں۔ یہ ہماری حمایت میں رپورٹنگ کرے گی۔ آپ ڈائس کی طرف توجہ دیں۔ تقریر جاری رکھیں۔"

اس نے ڈائس کی طرف پلٹ کر کہا۔ "ہاں تو بھائی! بزرگوار! میرے دوستو! آج ہم یہ وعدہ کریں کہ آئندہ دسمبر کی پہلی تاریخ سے لے کر اکتیس تاریخ تک گوشت نہیں کھائیں گے۔ نہ گائے کا نہ بکرے کا نہ مرغی کا۔ کسی کا بھی حلال گوشت نہیں کھائیں گے اور حرام تو ہم کھاتے ہی نہیں ہیں۔"

حاضرین اپنی جگہ سے اٹھ اٹھ کر کہنے لگے۔ "ہم ایک ماہ تک کسی قسم کا گوشت نہیں کھائیں گے۔ بازار سے نہیں خریدیں گے۔"

اسے 'جی خسرو نے کہا۔ "آپ یہ بھی وعدہ کریں کہ اس ایک ماہ میں ہم اپنے گھر کے اندر ایک مرغی کو بھی ذبح نہیں کریں گے۔"

حاضرین اس وعدہ کو دہرانے لگے۔ اور شینہ نے قریب آکر ذرا آہستگی سے کہا۔ "خسرو صاحب! آپ کی حمایت ہوگی اس بار آپ یاہاں ہاتھ اٹھا کر تقریر کریں۔ میں آپ کا ایک پوز بنا چاہتی ہوں۔"

وہ انکار کرنا چاہتا تھا۔ ڈاکس پر چیخ چیخ کر کہنا چاہتا تھا کہ میں ان لیڈروں میں سے نہیں ہوں جو اپنی پبلٹی کے لئے تصویریں مختلف پوز میں اتارنے ہیں اور اخبار میں شائع کرتے ہیں۔

لیکن وہ انکار نہ کر سکا۔ ذرا سر سمٹھا کر شینہ کی طرف دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس دو شیئر کے گلابی گلابی لبوں کے درمیان بیک پلس پلسی ہوئی تھی۔ اس نے ایک پلس کو اپنے ہونٹوں کے درمیان دانتوں سے دبا رکھا تھا۔ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اکثر رپورٹنگ کرنے والی لڑکیاں یا لڑکے جب تصویریں اتارتے ہیں تو لکھنے کی پلس یا ہل پین کو منہ میں اسی طرح دبا لیتے ہیں۔

لیکن ان ملائم لبوں کی پٹھریوں کے درمیان جیسے ایک کانٹا انک میا تھا۔ وہ کانٹا خسرو کی یاد سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ڈائس پر کھڑے کھڑے اپنی بیوی سلیمہ بیگم کے پاس پہنچ گیا جو اب مرحومہ بن چکی تھی۔ وہ حاضر دماغ تھا فوراً ہی اس جلسہ گاہ میں دفاعی طور پر حاضر ہو گیا۔ پھر کہنے لگا۔ "میں یقین سے کہتا ہوں اگر ہم ایک ماہ تک کسی دکان سے گوشت نہیں خریدیں گے۔ کوئی جانور خرید کر گھر نہیں لے جائیں گے اور اسے گھر کے اندر ذبح نہیں کریں گے۔ اپنی ہانڈی میں گوشت نہیں پکائیں گے تو گوشت کا بھاء بالکل ہی گر جائے گا۔ ایک ماہ بعد ہم انہی دکانداروں سے منہ مانگی قیمت پر گوشت حاصل کر سکیں گے۔"

تمام حاضرین خوش ہو کر تالیاں بجاتے لگے۔ اسے 'جی خسرو نے کہا۔ "یہ ہمارا پہلا مرحلہ ہو گا اگر ہماری تحریک کامیاب ہو جائے گی اور انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوگی تو ہم آئندہ ہونگائی کے خلاف دوسری تحریک چلائیں گے لیکن اس پہلی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے لازمی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے طور پر کوشش کرے۔ آپ اپنے پردوسیوں کو، اپنے بھائیوں کو، اپنے رشتے داروں کو فرداً فرداً سمجھائیں کہ جو تاریخ مقرر کر دی گئی ہے ان تاریخوں میں وہ گوشت کا استعمال بالکل ہی ترک کر دیں۔"

میرے بزرگوار! میرے بھائیو! میرے دوستو! آپ میرے اس منصوبے سے بخوبی سمجھ

سمجھتے ہیں کہ میں اقتدار کا بھوکا نہیں ہوں آپ مجھے ووٹ دیں گے یا نہیں دیں گے یہ آنے والا وقت بتائے گا مجھے اقتدار حاصل ہو گا یا نہیں ہو گا یہ اس وقت کی بات ہوگی لیکن اس وقت میں آپ لوگوں کے ساتھ مل کر منگنی ختم کرنا چاہتا ہوں۔ منگنی جو آپ کی 'آپ کے بچوں کی اور آپ کی آئندہ نسلوں کی دشمن ہے۔ اگر میں نے آپ کے ساتھ مل کر اسے آدھا مار ڈالا تو آپ یقین رکھیں اقتدار حاصل ہونے کے بعد جب میرے ہاتھ میں قانون ہوگا 'توت ہوگی تو میں اس منگنی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکوں گا۔

طرف جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تب وہ سیدھا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ پارٹی لیڈر عبدالجبار صدیقی تقریر کر رہا تھا۔ لوگ کبھی کبھی تکیاں بجا رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ خسرو نے اس کی تقریر کو توجہ سے سننے کی کوشش کی لیکن بار بار ٹاکلی ہوئی۔ بار بار اس کا ذہن ٹینٹ کی طرف چلا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے اپنی تقریر کے دوران حاضرین سے سوال کیا تھا۔ اگر اس جلسہ گاہ میں کوئی حسین دوشیزہ اپنی جلوہ نمائی کے تمام ساز و سامان سے آراستہ ہو کر آئے تو کیا ہم اس کے دیوانے ہو جائیں گے؟ اور وہ حسین دوشیزہ جلوہ دکھا کر چھپ جائے تو کیا ہم اسے بار بار دیکھنے کی ضد کریں گے۔ یہی اصول کا دوبارہ بھی کارنوا ہے۔

”دکھانا“ پھیلا پھیلا کر دکھانا۔

بھاؤ چلنے کا ہے اک بہانہ۔“

ٹینٹ کہاں چھپ گئی تھی؟ خسرو کی نظریں اسٹیج کے سامنے دور دور تک بھٹکتی لگیں۔ اسے ڈھونڈنے لگیں۔ وہ جلوہ دکھا کر چھپ گئی تھی۔ اس نے پہلے ہی مرحلے میں اپنا بھاؤ اس حد تک بڑھا دیا تھا کہ خسرو کی نظریں ایک جگہ ٹھہرنا بھول گئی تھیں۔ اسے شعوری طور پر یہ احساس نہیں تھا کہ وہ خریدار بن کر معرکے بازار میں پہنچ چکا ہے۔ جلسہ بہت ہی کامیاب رہا تھا۔ واپسی میں پارٹی کے اہم افراد ایک بڑی سی دنگن میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ راستے میں پارٹی لیڈر عبدالجبار صدیقی نے کہا: ”ہمارا کوئی خاص لائن آف ایکشن نہیں ہے۔ تقریر کرنے کا موقع آتا ہے تو مسٹر اے“ جی خسرو اپنے طور پر چہ نہیں کیا کچھ بول جاتے ہیں۔ انہیں اس بات کا خیال نہیں رہتا کہ جو بول رہے ہیں وہ بات قابل عمل ہے بھی یا نہیں۔“

پارٹی کے جنرل سیکرٹری نے کہا: ”میں نے پہلے ہی خسرو صاحب سے کہا تھا کہ یہ منگائی لٹا کی تحریک چلانا مناسب نہیں ہے خدا نخواستہ ہمیں ٹاکلی ہوئی تو ہماری پارٹی پر ہی طرح پر نام ہوگی اور ہم آئندہ ایکشن میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔“

خسرو نے کہا: ”اگر ہم اپنے منصوبے پر پوری طرح عمل کریں گے، دن رات لگن سے کام کریں گے تو کامیابی یقینی ہے۔“

صدیقی نے کہا: ”خسرو صاحب! یہی تو مشکل ہے کہ آپ جوان ہیں۔ جوش اور

جذبے سے بولتے ہیں۔“

”صدیقی صاحب! اگر آپ مجھے جوان کہہ کر درپردہ نڈان کہنا چاہتے ہیں تو میں بتا دوں کہ میری عمر پینتیس برس ہے۔ بے شک میرا شمار جوانوں میں ہوتا ہے لیکن عمر کے لحاظ سے میں سنجیدہ بھی ہوں۔“

”آپ نے سنجیدگی سے یہ نہیں سوچا کہ منگائی لٹا کی مسم چلانے کے لئے ہمیں کتنے کارکنوں کی ضرورت پڑے گی۔ ہمیں گھر گھر جا کر لوگوں کو سمجھانا ہوگا کہ وہ ایک ماہ تک گوشت نہ پکائیں۔ صرف گھروں میں نہیں بلکہ شہر کے ہر چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں جا کر انہیں سمجھانا ہوگا۔ انہیں سمجھانے کے لئے پوسٹر شائع کرنے ہوں گے۔ اخبارات کے اشتہارات کے ذریعے عوام سے اپیل کرنی ہوگی۔ اس میں بے تحاشہ رقم بھی خرچ ہوگی۔ اور تو اور ہمیں آرام سے بیٹھنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ دن رات ہم پریشانیوں میں مبتلا رہیں گے۔“

خسرو نے پوچھا: ”کیا آپ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر لیڈر بننا چاہتے ہیں۔ جناب لیڈر بنانا آسان نہیں ہے۔ آپ کو عوام تک پہنچنے کے لئے ایک ایک دروازے پر جانا ہوگا۔ تبھی آپ کامیاب ہو سکیں گے۔“

”تم مجھے کیا سکھا رہے ہو۔ میں تم سے عمر اور تجربے میں بڑا ہوں۔ میں نے تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ تم سے زیادہ سیاست میں رہا ہوں۔“

اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے سیلمہ غفار بھائی نے کہا: ”ارے بھلا! تم لوگ آپس میں کیوں لڑائی کرتے ہو؟ میری ساری رقم ڈوب جائے گی۔ دیکھو، تم نے آپس میں فیصلہ کیا تھا کہ ووٹ حاصل کرنے کے لئے تحریک چلائیں گے۔ وہ تحریک جیسی بھی ہو، سب مل کر کام کریں گے۔ اب خسرو صاحب نے ایک تحریک چلانے کا فیصلہ کر لی لیا ہے تو ہم سب کو ساتھ دینا چاہئے۔ مسٹر صدیقی! جھگڑا کرنے سے ہم سب کا نقصان ہوگا۔“

صدیقی نے کہا: ”یہ جھگڑے کی نہیں سوچنے سمجھنے کی بات ہے۔ گوشت مسلمانوں کی کھٹی میں شامل ہے اور آپ لوگ ایک ماہ کے لئے ان سے گوشت چھڑانا چاہتے ہیں۔ مجھے تو کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے۔ تاہم میں پوری لگن سے آپ لوگوں کا ساتھ دوں گا۔ ہم سب مل کر اپنے تمام ذرائع استعمال کریں گے اس کا اعلان خسرو صاحب نے اپنی

طرف جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تب وہ سیدھا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ پارٹی لیڈر عبدالجبار صدیقی نے تقریر کر رہا تھا۔ لوگ بھی بھیٹیاں بجا رہے تھے اور خروشے لگا رہے تھے۔ خروشنے اس کی تقریر کو توجہ سے سننے کی کوشش کی لیکن بار بار ٹاکائی ہوئی۔ بار بار اس کا ذہن ٹینے کی طرف چلا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے اپنی تقریر کے دوران حاضرین سے سوال کیا تھا کہ اگر اس جلسہ نگاہ میں کوئی حسین و شیزہ اپنی جلوہ نمائی کے تمام ساز و سامان سے آراستہ ہو کر آئے تو کیا ہم اس کے دیوانے ہو جائیں گے؟ اور وہ حسین و شیزہ جلوہ دکھا کر چھپ جائے تو کیا ہم اسے بار بار دیکھنے کی ضد کریں گے۔ یہی اصول کاروبار میں بھی کارفرما ہے۔

”دکھانا“ چھپانا۔ چھپا کر دکھانا۔

بھلا چھپانے کا ہے اک بھلا۔

ٹینے کمال چھپ گئی تھی؟ خروش کی نظریں اسٹیج کے سامنے دور دور تک بھٹکتی لگیں۔ اسے ڈھونڈنے لگیں۔ وہ جلوہ دکھا کر چھپ گئی تھی۔ اس نے پہلے ہی مرحلے میں اپنا بھلا اس حد تک بڑھا دیا تھا کہ خروش کی نظریں ایک جگہ ٹھہرنا بھول گئی تھیں۔ اسے شعوری طور پر یہ احساس نہیں تھا کہ وہ خریدار بن کر مصر کے بازار میں پہنچ چکا ہے۔ جلسہ بہت ہی کامیاب رہا تھا۔ واپسی میں پارٹی کے اہم افراد ایک بڑی سی دنگن میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ راستے میں پارٹی لیڈر عبدالجبار صدیقی نے کہا۔ ”ہمارا کوئی خاص لائن آف ایکشن نہیں ہے۔ تقریر کرنے کا موقع آتا ہے تو مسٹر اے جی خروشا اپنے طوطے پر نہیں کیا کچھ بول جاتے ہیں۔ انہیں اس بات کا خیال نہیں رہتا کہ جو بول رہے ہیں وہ بات قابل عمل ہے بھی یا نہیں۔“

پارٹی کے جنرل سیکرٹری نے کہا۔ ”میں نے پہلے ہی خروشا صاحب سے کہا تھا کہ یہ منگائی ٹھانہ کی تحریک چلانا مناسب نہیں ہے خدا نخواستہ ہمیں ٹاکائی ہوئی تو ہماری پارٹی بری طرح بدنام ہوگی اور ہم آئندہ ایکشن میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔“

خروش نے کہا۔ ”اگر ہم اپنے منصوبے پر پوری طرح عمل کریں گے، دن رات لگن سے کام کریں گے تو کامیابی یقینی ہے۔“

صدیقی نے کہا۔ ”خروشا صاحب! یہی تو مشکل ہے کہ آپ جوان ہیں۔ جوش اور

جذبے سے بولتے ہیں۔“

”صدیقی صاحب! اگر آپ مجھے جوان کہہ کر درپردہ نادان کہتا چاہتے ہیں تو میں بتا دوں کہ میری عمر پینتیس برس ہے۔ بے شک میرا شمار جوانوں میں ہوتا ہے لیکن عمر کے لحاظ سے میں سنجیدہ بھی ہوں۔“

”آپ نے سنجیدگی سے یہ نہیں سوچا کہ منگائی ٹھانہ کی مسم چلانے کے لئے ہمیں کتنے کارکنوں کی ضرورت پڑے گی۔ ہمیں گھر گھر جا کر لوگوں کو سمجھانا ہوگا کہ وہ ایک ماہ تک گوشت نہ پکائیں۔ صرف گھروں میں نہیں بلکہ شہر کے ہر چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں جا کر انہیں سمجھانا ہوگا۔ انہیں سمجھانے کے لئے پانچ سو شائع کرنے ہوں گے۔ اخبارات کے اشتہارات کے ذریعے عوام سے اپیل کرنی ہوگی۔ اس میں بے تحاشہ رقم بھی خرچ ہوگی۔ اور تو اور ہمیں آرام سے بیٹھنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ دن رات ہم پریشانیوں میں مبتلا رہیں گے۔“

خروش نے پوچھا۔ ”تو آپ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر لیڈر بننا چاہتے ہیں۔ جناب لیڈر بننا اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ کو عوام تک پہنچنے کے لئے ایک ایک دروازے پر جانا ہوگا۔ سبھی آپ کا سیلاب ہو سکیں گے۔“

”تم مجھے کیا سکھا رہے ہو۔ میں تم سے عمر اور تجربے میں بڑا ہوں۔ میں نے تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ تم سے زیادہ سیاست میں مہا ہوں۔“

اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے سید غفار بھٹائی نے کہا۔ ”اگر تم لوگ آپس میں کیوں لڑائی کرتے ہو، میری ساری رقم ڈوب جائے گی۔ دیکھو، تم نے آپس میں فیصلہ کیا تھا کہ ووٹ حاصل کرنے کے لئے تحریک چلائیں گے۔ وہ تحریک بھی ہو، سب مل کر کام کریں گے۔ اب خروشا صاحب نے ایک تحریک چلانے کا فیصلہ کر لی لیا ہے تو ہم سب کو ساتھ دینا چاہئے۔ مسٹر صدیقی! جھگڑا کرنے سے ہم سب کا نقصان ہوگا۔“

صدیقی نے کہا۔ ”یہ جھگڑے کی نہیں، سوچنے سمجھنے کی بات ہے۔ گوشت مسلمانوں کی کھٹی میں شامل ہے اور آپ لوگ ایک ماہ کے لئے ان سے گوشت چھڑانا چاہتے ہیں۔ مجھے تو کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے۔ تاہم میں پوری لگن سے آپ لوگوں کا ساتھ دوں گا۔ ہم سب مل کر اپنے تمام ذرائع استعمال کریں گے اس کا اعلان خروشا صاحب نے اپنی

کئی تقریروں میں کیا ہے۔ اب اعلان ہو چکا ہے تو لاج رکھنی ہی ہوگی۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ گاڑی ایک پختہ سڑک پر دوڑتی رہی۔ پھر سینٹہ غفار بھائی کے بڑے بھائی ستار بھائی نے کہہ "اجی" کھسرو بھائی! میں تم کو کتنی باری بولا....."

خسرو نے اس کی بات کاٹ کر کہہ "ستار بھائی! بڑی مشکل ہے آپ کو کئی بار سمجھایا کہ میرا نام اجی کھسرو نہیں 'اے' جی خسرو ہے۔"

ستار بھائی نے کہہ "ہا! کوئی بھی نام ہونے دو۔ نام سے نہیں کام سے مطلب رکھو۔ تم کو کئی باری بولا اُدھر بڑا لڑ میں رہنے سے لیڈری نہیں چکنے کو ہے۔ اس کو چکانے کے لئے سوسائٹی میں عزت بنانے کو ہے۔ عزت بنانے کے لئے بڑے پتکے میں بڑی کوشش میں رہنے کو ہے۔ کار میں بیٹھ کر گھومنے کو ہے۔ تم بس میں آؤ گے 'جاؤ گے' تو لوگ تم کو دن رات دیکھتے رہیں گے۔ دن رات دیکھنے سے وہ بات نہیں ہوتی۔ بھی دیکھو! ہم تمہاری زبان میں ٹھیک سے سمجھنا نہیں سکتے۔"

سینٹہ غفار بھائی نے کہہ "میں سمجھتا ہوں۔ دیکھو! ابھی تم نے تقریر میں کہا تھا کہ جلوہ دکھانا اور پھر چھپانا اور پھر بھاؤ بڑھانا تو اسی طرح اپنے کو سمجھو۔ تم جلسے میں آکر اپنا جلوہ دکھاتے ہو 'بڑی مزے کی تقریر بھاؤتے ہو۔ اس کے بعد اگر تم چھپ کر رہو۔ سب سے نہ ملو۔ کبھی کبھی کار میں گزرتے ہوئے لوگوں کو نظر آجائے تو اس میں شان ہوگی۔ جو عزت ہوگی 'لوگ' تمہیں جو دلچسپی سے دیکھیں گے اور تیارے ہارے میں جو سوچیں گے' وہ بات بڑا بورڈ میں رہنے اور بس میں سفر کرنے سے نہیں ہوگی۔ تم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

خسرو نے کہہ "سینٹہ صاحب! میرا ایک نظریہ ہے۔ سیدھا اور سچا نظریہ۔ میں اپنے آپ کو لیڈر نہیں کہتا۔ لوگ مجھے لیڈر کہہ لیں' یہ دوسری بات ہے۔ میں اپنے عوام کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ کرنے کے لئے ان کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتا ہوں۔ ان کے دروازے پر جانا چاہتا ہوں۔ جب تک میرے ملک کا ایک آدمی بھی چٹائی پر سو رہا ہے' میں بھی چٹائی پر سو رہا ہوں۔ جب تک میرے لوگ کچے مکان اور جگہوں میں رہیں گے اس وقت تک میں بھی بڑا بورڈ کے ایک چھوٹے سے مکان میں زندگی گزار رہا ہوں۔"

مہرانی نے کہہ "مسر خسرو! جب آپ ہادری پارٹی میں شامل ہوئے تھے اسی وقت میں نے سینٹہ ستار بھائی اور سینٹہ غفار بھائی سے کہہ دیا تھا کہ تم ایک بہترین سماجی کارکن بن سکتے ہو مگر لیڈر کبھی نہیں بن سکتے۔"

خسرو نے افسوس ناک انداز میں ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہہ "ہمارے ملک کا المیہ یہی ہے۔ ہمارے یہاں بہترین دماغ ہیں۔ بین الاقوامی حالات کو سمجھنے والے معاملہ فہم لوگ ہیں۔ ایسے لوگ ہیں جو سیاست کی آگ میں چپ کر کندن بن چکے ہیں لیکن وہ غریب ہیں یا اتنے امیر نہیں ہیں کہ انتخابی مہمات میں حصہ لے سکیں۔ انتخابی مقابلے کو اتنا منگا کر دیا گیا ہے کہ عام تعلیم یافتہ سخی اور سیاسی شعور رکھنے والے اس میں حصہ لینے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ الیکشن کے وقت وہ محض سماجی کارکن بن کر رہ جاتے ہیں یا دولت مند لیڈروں کے آلہ کار بن جاتے ہیں لیکن لیڈر نہیں بن سکتے۔"

سب نے ناگواری سے منہ ہٹا لیا لیکن جواب کسی نے کچھ نہیں کہہ کئے کو وہ بہت کچھ کہہ سکتے تھے۔ گہری گہری سانس لیتے تھے لیکن جھگڑا بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ ان دنوں اے' جی خسرو کا نام اچھل رہا تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ اس کی لیڈری چکنے والی ہے لہذا وہ اس کے چکنے کا انتظار کر رہے تھے۔

گاڑی میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بڑی مصلحت اندیش خاموشی تھی۔ وہ سب کے سب یوں خاموش اور خطر رہا کرتے تھے جیسے ان کے درمیان خسرو نہ ہو' ایک بلخ ہو' اور وہ بلخ جلد ہی سونے کا انڈا دینے والی ہو۔

دوسرے دن شہر کے تمام اخبارات نے اس جلسے کی روداد شائع کی۔ کتنے ہی اخبارات نے شہر سرفی کے بعد اے' جی خسرو کا نام جلی حروف میں شائع کیا اور اس کے ساتھ ہی لکھا "منگلی ٹھکانہ۔"

منگلی کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کا خوب ذکر کیا گیا تھا اور توقع کی گئی تھی کہ اس تحریک کی مخالفت میں اور حمایت میں ابھی بحث مباحثے جاری رہیں گے۔ ملک کے دانشور اس تحریک کے سلسلے میں مضامین لکھیں گے۔ یہ بھی توقع کی گئی تھی کہ حکومت وقت کی طرف سے کوئی رد عمل ظاہر ہوگا۔

روزنامہ اتحاد کی رپورٹر اور فوٹو گرافر شینہ درانی نے تو کمال کر دیا تھا۔ اے' جی

خسرو کی ایک بڑی سی تصویر اس اخبار کے پہلے صفحے پر شائع ہوئی تھی۔ تصویر میں خسرو اپنا ہایا ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا جب خسرو نے اس تصویر کو دیکھا تو چونک گیا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ ایک بار تصویر اتارنے سے پہلے ٹینے نے اس سے ہایا ہاتھ اٹھانے کی فرمائش کیوں کی تھی؟

یوں کی تھی کہ خسرو کی فیض بائیں بغل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جب وہ جو شیلے انداز میں ہاتھ اٹھا کر گھونسلہ دکھا کر تقریر کر رہا تھا تب ہی ٹینے نے وہ تصویر اتار لی تھی۔ اس تصویر میں فیض کا پچھلا ہوا بغل حصہ صاف طور پر نظر آرہا تھا۔ تصویر کے ساتھ کچھ لکھی ہوئی تھی۔ ”غریب عوام کا غریب لیڈر جو پھٹا ہوا لباس پہنتا ہے۔ زمین پر بیٹھ کر کھاتا ہے اور چٹائی بچھا کر سوتا ہے۔“

ایسی باتیں ایسی تصویریں اور ایسا فقیرانہ انداز عوام کے دل جیت لیتا ہے۔ اس تصویر کا بھی چرچا ہونے لگا۔ اپوزیشن پارٹی کے لوگ اس دھماکہ خیز تصویر اور جملے کی روداد سے پریشان ہو گئے۔ سب سے زیادہ پریشانی کا سبب وہ تحریک تھی جو چلائی جانے والی تھی۔ اس تحریک کی کامیابی اپوزیشن پارٹی کی ناکامی ہوتی اس لئے وہ سب سر جو ڈکر بیٹھ گئے۔ سوچنے لگے آپس میں بحث کرنے لگے کہ کس طرح منگائی ٹھکانے کی تحریک کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔

ایک نے کہا ”اے جی خسرو نے بہت سی سوچ سمجھ کر تحریک چلانے کے لئے دسمبر کی پہلی تاریخ مقرر کی ہے۔ نومبر کی انٹیس تاریخ کو بھروسہ مید ہے۔ لوگ اس قدر کھائیں گے کہ ایک ہفتہ تک گوشت کی ہوس نہیں رہے گی۔ تحریک کی ابتدا میں دکانیں واقعی بند رہیں گی یا کھلی رہیں گی تو کوئی گاہک ادھر نہیں جائے گا۔“

دوسرے نے کہا ”یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ہم مسلمان بھائی پوری گائے یا بھرا اونٹ کھا لینے کے بعد ڈکار لیتے ہیں۔ پھر دوسرے دن گوشت کھانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ اصل میں اس تحریک کی ابتدا گوشت سے نہیں سبزوں سے شروع ہونی چاہئے تھی۔ پہلے سبزوں کے خلاف محاذ بٹایا جائے۔ ان کی قیمت گرانی جائے۔“

اپوزیشن پارٹی کے لیڈر نے کہا ”اے جی خسرو نے اپنی ذہانت کے مطابق پہلے گوشت کی منگائی کے خلاف محاذ بٹایا ہے۔ اگر سبزوں کے خلاف محاذ بٹایا جاتا تو تحریک

شاید کامیاب نہ ہوتی کیونکہ سبزیاں امیر سے لے کر غریب تک سبھی کھاتے ہیں۔ البتہ غریب گوشت نہیں کھا سکتے۔ کبھی کبھی کھانے کا حوصلہ کر لیتے ہیں تو ایک دو وقت کے فائدے کرنے پڑتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس تحریک سے اے جی خسرو کو غریب عوام کی بھرپور حمایت حاصل ہوگی۔ دولت مند بھی ایک ماہ تک دکانوں سے گوشت نہیں خریدیں گے۔ خریدنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ ڈیپ فریزر میں ایک ماہ کا اسٹاک رکھ لیں گے اگر ہر دولت مند اپنے ہاں دس بکسے خرید کر رکھے لے گا تو اس کے تیس دن آرام سے گزر جائیں گے۔“

ایک نے پوچھا۔ ”پھر اس تحریک کا فائدہ کیا ہوگا۔ کبھی تو اپنے گھروں میں چھپ کر گوشت کھائیں گے۔“

”فائدہ یہ ہوگا کہ قصائیوں کی دکانوں پر مندا ہوگا۔ وہ منہ مانگی قیمت پر گوشت فروخت نہیں کر سکیں گے۔ یقیناً انہیں گوشت کی قیمت کم کرنی ہوگی۔“

وہاں ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا ”یہ ایک بھگات منصوبہ ہے۔ نہ پانچوں انگلیاں برابر ہو سکتی ہیں نہ تمام شرعیم خیال ہو سکتا ہے۔ لوگوں کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے ہزار تحریکیں چلائی جائیں تب بھی لوگ اپنے مزاج کے مطابق کھاتے پیتے رہیں گے۔ دانشمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ تحریک ایسی چلائی جائے جس سے عوام کی ذاتی زندگی پر کوئی اثر نہ پڑے۔“

”اس تحریک کے سلسلے میں متضاد رائے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کامیاب ہوگی کوئی کہتا ہے ناکامی ہوگی۔ ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ اسے کام کس طرح بنایا جائے؟“

ایک نے کہا۔ ”آج خبر کی چوبیس تاریخ ہے۔ اس تحریک کو شروع ہونے کے لئے ابھی تقریباً سوا دو مہینے ہیں۔ وہ لوگ اپنی کامیابی کے لئے اس عرصے میں بڑی سرگرمیاں دکھائیں گے ہمارے پاس ابھی ان کے خلاف محاذ آرائی کے لئے کافی وقت ہے۔ ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“

بزرگ نے کہا۔ ”تم اپنے طور پر جو کرنا چاہو کرو لیکن میرا ایک مشورہ مان لو۔ سنا ہے کہ خسرو کے بیوی بچے نہیں ہیں۔ جو تھائی کی زندگی گزارتے ہیں وہی ایسے بے سگے منصوبے بناتے ہیں اور بیوی بچوں کی ضروریات کو نہیں سمجھتے۔“

پارٹی لیڈر نے پوچھا۔ ”بیوی بچے نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کے بوڑھے والدین ہیں۔ چار بہنیں ہیں۔ دو بھائی ہیں۔ ان سب کی کفالت اسی کے ذمہ ہے۔ وہ ایک عرصہ سے اپنے تمام خاندان کی پرورش کرتا آ رہا ہے۔“

بزرگ نے کہا۔ ”اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ سارا خاندان ایک طرف اور ایک بیوی ایک طرف۔ میں کہتا ہوں کسی طرح اس کی زندگی میں ایک عورت آجائے تو اس کی تحریک کی تہہ میں خود بخود بارودی سرنگیں بچھتی چلی جائے گی۔“

☆-----☆-----☆

اے ’جی خسرو کی عجیب حالت تھی۔ صبح سے تمام اخبارات اس کا نام لے لے کر چھپ رہے تھے۔ وہ سری طرف شینہ اس کے اندر شور مچا رہی تھی۔ ایک طرف سیاسی کاسیانی کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ دوسری طرف شینہ اس کی مرحومہ بیوی سلیقہ بیگم کی یاد دلا رہی تھی۔

اب سے تقریباً زیادہ برس پہلے اس نے سلیقہ کو دیکھا تھا۔ اس کے رشتے داروں نے کہا تھا۔ ”لڑکی بہت شرمیلی ہے سائے نہیں آئے گی۔ اگر دیکھ کر ہی شادی کرنا چاہتے ہو تو ہم چپکے سے دکھا دیں گے۔“

پھر اس کا اہتمام کیا گیا۔ سلیقہ ایک کرسی پر گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ سوچ رہی تھی۔ سوچنے کے انداز میں بڑی دلکشی تھی۔ وہ بے خیالی میں اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو منہ میں دبائے ہوئے تھی۔ جیسے کوئی ننھی سی بچی انگوٹھا چوس رہی ہو۔ اگر بچپن کی کوئی عادت ساتھ چلتے چلتے جوانی تک پہنچ جائے تو وہ بڑی بھولی بھی لگتی ہے اور بھلی بھی۔ اس انگوٹھا چوسنے کی عادت میں بچپن کی معصومیت بھی تھی اور جوانی کا لہریں بھی تھا۔ وہ بہت ہی اچھی لگ رہی تھی۔ اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ خسرو نے فوراً ہی شادی کی ہانی بھر لی۔

چھ ماہ بعد شادی ہوئی۔ سلیقہ دلنشین کر اس کی زندگی میں آگئی تھی۔ اس کی غریب میں خوش رہتی تھی۔ کبھی کسی چیز کی کمی ہو تو شکایت نہیں کرتی تھی۔ اس میں سادی خوبیاں تھیں۔ بس وہ ایک بچپن والی عادت ایسی تھی جسے وہ چھوڑ نہیں سکتی تھی۔

انگوٹھا چوسنے کی عادت نہ اچھی ہوتی ہے نہ بری ہوتی ہے۔ عمر کے لحاظ سے معیوب

ہوتی ہے۔ ابتدا میں وہ اس عادت کو چھڑانہ سکا۔ رفتہ رفتہ ان کے درمیان۔ بے تکلفی بڑھنے لگی۔ اس بے تکلفی نے رفتہ رفتہ پرانی عادت کا رخ بدل دیا۔ کچھ نوگ سرگرمی کی عادت چھوڑنے کے لئے پان کھانا شروع کر دیتے ہیں اور کچھ پان کی عادت چھوڑنے کے لئے سوف چھالیہ منہ میں رکھنے لگتے ہیں۔ خسرو کبھی اسے پان لا کر کھلا دیتا تھا کبھی سوف اور چھالیہ سے بہلا دیتا تھا۔

بچپن کی وہ عادت ختم ہونے لگی لیکن سلیقہ نے اسے بالکل ہی ختم نہیں کیا۔ جب کبھی خسرو اس کی کوئی بات نہیں مانتا تھا یا کسی قسم کا جھگڑا ہو جاتا تھا تو وہ ناراض ہو کر اس سے دور چلی جاتی تھی اور دور ہی سے صیغہ دکھاتی تھی۔ اسے جلانے کے لئے رانتوں تلے انگوٹھے کو داب کر بیٹھنے کھکھکلائے لگتی تھی۔

دانتوں تلے انگلی دہانا ایک محاورہ ہے لیکن رانتوں تلے انگوٹھا دہانے سے وہ جل جاتا تھا۔ وہ انگوٹھا جیسے اس کا رقیب تھا۔ وہ غصہ دکھانے لگتا تھا۔ مرد کا غصہ دہل روٹی کی طرح ہوتا ہے۔ عورت روز ہی مضم کر لیتی ہے۔ سلیقہ پر اس کے غصے کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ تب وہ مجبور ہو کر اس کی ہر بات مان لیتا تھا۔ عورت کو اپنی بات منوانے کی ضد ہوتی ہے۔ جب شوہر مان لیتا ہے تو وہ بھی اپنی مادوں سے باز آ جاتی ہے۔

ایک لیڈر کی خشک زندگی میں بھی اپنی محبوبہ سے روٹھنے اور ایک دوسرے کو مٹانے کی خوبصورت گمزیاں آتی ہیں لیکن گمزی گمزی نہیں آتیں۔ سلیقہ ان خوبصورت لمحوں کے ساتھ گمزر گئی۔ دو برس تک بھرپور ازدواجی سرگرمی دینے کے بعد ایک دن اچانک موت کی آغوش میں چلی گئی۔ تب سے وہ دیران ہو گیا۔ اپنے نئے رشتوں کے ہجوم میں بھی وہ تھما رہے لگ۔ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوششیں کر کے لگ۔ اس کی والدہ نے اس کے دوسرے رشتے داروں نے کئی بار سمجھایا کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ کتنی ہی لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں۔ اچھی لڑکیاں تھیں، تعلیم یافتہ تھیں۔ سلیقہ کی طرح شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان لڑکیوں میں شریک حیات بننے کی تمام خوبیاں موجود تھیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی وہ بچپن نہیں تھا جو سلیقہ میں تھا۔ سلیقہ کی موت کے بعد اس کا وہ بچپنا یاد آتا تھا اور اسے بہت تڑپاتا تھا۔

اس کے بعد وہ تھما رہا اس عرصے میں اس نے کتنی ہی لڑکیوں سے دوستی کی۔ کسی

کا استعمال چاری رکھنا کوئی ضروری نہیں ہے۔ مثلاً میرے گھر میں کبھی گوشت نہیں پکا ہے۔ ہم دال روٹی یا سستی سبزیوں پر گزارا کرتے ہیں۔ ہم منگالیاں کبھی نہیں پہنتے۔ میری جوان بہنیں کبھی لپ اسٹک، پوڈر اور سنو کا استعمال نہیں کرتیں۔ جسم کی صفائی اور چہرے کی تازگی کے لئے یوں تو ہم روزانہ غسل کرتے ہیں لیکن ہفتے میں ایک بار غسل کرنے سے پہلے اٹھن لیتے ہیں۔ اس طرح جسم کی مکمل صفائی ہوتی رہتی ہے اور چہرے پر ایسا نکھار آتا ہے کہ ایسا منگے کریم اور پوڈر سے نہیں آسکتا۔

ٹینڈ سر جھکائے اس کی باتوں کو کاپی میں نوٹ کرتی جا رہی تھی۔ پھر وہ لکھتے لکھتے رک گئی۔ بال بین کے آخری سرے کو داغوں سے دبا لیا۔ ہونٹوں کو بند کر لیا اور سوچنے لگی۔ خسرو کے اندر سسناہٹ سی ہونے لگی۔ وہ بال بین ایک تنہی سی ڈال کی طرح نظر آ رہا تھا اور اس ڈال کے سرے پر پھڑکتے ہوئے لبوں کی کلی دکھائی دیتی تھی۔ پھر وہ کلی کھل کر ہوئی۔ ”خسرو صاحب! مانا کہ اٹھن سے چہرے پر نکھار آ جاتا ہے لیکن بلاشبہ ہونٹی نہیں آتی۔ میرا مطلب ہے بشرطہ کے کئی ٹینڈ لٹے ہیں لیکن مشرق میں ایسے سنگھار کا کوئی سلمان نہیں ہے۔ ہونٹوں کو سرخ کرنے کے لئے پان کھانا پڑتا ہے اور پان کھانے سے دانت خراب ہوتے ہیں۔“

اس کے لبوں کا لکڑی رنگ بالکل تازہ اور روشن روشن تھا۔ جیسے وہ گلابیت ابھی ابھی پیدا ہوئی ہو اور ابھی دیکھنے والے کی نظروں کو پکار رہی ہو۔ وہ بال بین کو ہونٹوں میں دبائے ہوئے رہنے کی عادی تھی۔ چند حروف کی ادائیگی کے وقت دونوں ہونٹ آپس میں مل جاتے ہیں۔ اس کے لب بھی ایسے ہی وقت بال بین کے حکم پر ملتے تھے۔ اوپر گئے کے لب بال بین کو چھوئے تھے، چھیڑتے تھے۔ اپنی پہچان کراتے تھے پھر دوسرے حروف کے میلے میں پھجڑ جاتے تھے۔

وہ اپنی کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ زندگی میں پہلی بار چپکے چپکے تسلیم کرنے لگا کہ جو رنگ جنک ہے وہیں اچھا لگتا ہے۔ پھولوں سے ان کے رنگ چھیننے کا حق اسے نہیں ہے وہ ایک بھائی کی حیثیت سے اپنی بہنوں کو رنگ و روپ کے سلمان سے محروم کر سکتا ہے لیکن محبوبہ کے متعلق ایسا نہیں سوچ سکتا۔ سوچے گا تو شاعری مر جائے گی۔ آنکھوں سے رنگ اڑ جائیں گے۔ ٹینڈ بلیک اینڈ وائٹ نظر آئے گی۔

کو دور سے آزمانا رہا۔ کسی کو قریب سے پرکھنا رہا۔ آخر ٹینڈ آگئی اور آتے ہی اس نے سلیقہ کی یاد تازہ کر دی۔ وہ ٹاسل منہ میں دبائے اس سے پوچھ رہی تھی۔ ”کیا آپ مصروف ہیں؟“

خسرو خیالات سے چونک گیا۔ ہڑبڑا کر سیدھی طرح کرسی پر بیٹھ گیا۔ سامنے کھلے ہوئے دروازے پر ٹینڈ کھڑی تھی۔ مسکرا کر کہہ رہی تھی۔ ”مجھے یہاں آنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ دوسرے کمرے میں آپ کی والدہ نے مجھے روک لیا تھا۔ آپ کی امی بہت اچھی ہیں۔ بہت اچھی باتیں کرتی ہیں۔ آپ کے قیمتی وقت کا خیال نہ ہوتا تو میں ان سے ہی باتیں کرتی رہ جاتی۔“

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اپنے چنڈ بیک سے ایک کاپی اور بال بین لٹائے لگی ”خسرو نے کہا۔“ مجھ سے کوئی سوال کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ میرے گھر کو ”میرے ماحول کو دیکھ لو۔ اس سے مجھے سمجھنے اور میرے متعلق کچھ لکھنے میں کافی مدد ملے گی۔“

”میں نے آپ کا گھر دیکھا ہے۔ مجھے بڑی حیرانی ہے، یہاں کسی کمرے میں ایک چارپائی بھی نہیں ہے۔ کیا واقعی آپ لوگ چٹائی پر سوتے ہیں؟“

”جی ہاں، جب ہم چٹائی پر سو سکتے ہیں تو کیا ضروری ہے کہ قیمتی پلنگ گھر میں لایا جائے؟“

”لیکن آرام و آسائش بھی تو کوئی چیز ہے۔ آخر یہ کرسیاں بھی آرام سے بیٹھنے کے لئے ہیں۔“

”یہ نہایت سستی کرسیاں ہیں۔ میرے ہاں ملنے والے اکثر پتلون پہن کر آتے ہیں۔ میں انہیں فرش پر بٹھا نہیں سکتا۔ میں اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو ایک سادہ زندگی گزارنے پر مجبور کر سکتا ہوں، دوسروں کو مجبور نہیں کر سکتا۔“

”گویا آپ عوام کے سامنے ایک سادہ زندگی کا عملی نمونہ پیش کر رہے ہیں؟“

”ایک رہنما کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ جو چاہتا ہے پہلے خود اس پر عمل کرے۔“

”کیا آپ چاہتے ہیں کہ پوری قوم چٹائی پر بیٹھنا اور سونا شروع کر دے؟“

”ہرگز نہیں۔ میں تو سادہ زندگی کی مثال پیش کر رہا ہوں۔ عوام تک یہ بات پہنچانا چاہتا ہوں کہ جو چیز قیمتی ہے اور ہماری زندگی کے لئے لازمی نہیں ہے اسے خریدنا اور اس

اور پھول رنگ و بو کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

ثمینہ نے سوال کیا۔ ”کیا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ پھول کو گلہان میں جا کر رکنا چاہئے؟“

”ہاں! پھول کا مقام یہ بھی ہے۔ ہم اس طرح پھول کی قدر کر سکتے ہیں۔“
 ”پھر آپ اپنی بہنوں کے لئے اس گھر کو گلہان کیوں نہیں بناتے۔ انہیں اچھے رنگ برنگے لباس کیوں نہیں پہناتے؟ انہیں راج بن کر رہنے کا موقع کیوں نہیں دیتے؟ آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ آپ کی بہنیں بھی دوسروں کی آنکھوں میں خواب جگا سکتی ہیں۔ کسی کے دل میں جگہ بنا کر کسی کی دلن بن کر اپنا صحیح مقام حاصل کر سکتی ہیں۔“

”بس ثمینہ! ہر شخص اپنے گھر کی چار دیواری میں اپنے طور پر زندگی گزارتا ہے۔ میں یا میرے خاندان والے کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ہمارے گھر کی بیٹیاں اور بہنیں کہیم پوڈر اور لپ اسٹک کے ذریعے خوب میک اپ کریں تاکہ انہیں دیکھ کر ان کا رشتہ مانگنے والے ہمارے دروازے پر آئیں۔ ہم اپنے گھر کی عزت کو نمائش کی چیز نہیں بنا سکتے۔“

”خسرو صاحب! میں ایک اخباری رپورٹر ہوں اور آپ ایک ابھرتے ہوئے سیاسی لیڈر ہیں۔ آپ خوب سوچ سمجھ کر جواب دیں۔ اگر آپ محبوبہ کو نمائش کی چیز بنا کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسے پورے رنگ و روپ کے ساتھ اپنے دل میں اتارنا چاہتے ہیں تو پھر آپ اپنی بہنوں کے متعلق ایسا کیوں نہیں سوچتے۔ کیا آپ ان رہنماؤں میں سے ہیں جو دوسروں کے لئے کچھ سوچتے ہیں اور اپنے لئے کچھ؟“

ثمینہ کے اس سوال پر خسرو بوکھلا گیا۔ اس نے جلدی سے کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھے ہوئے کہہ۔ ”یہ تم کیسے سوالات کر رہی ہو؟ سیاست میں بھلا روئائش کا کیا دخل ہے؟“

”لوگ آپ کی ذاتی زندگی کے متعلق بھی معلوم کرنے میں دلچسپی رکھیں گے۔ جب انٹرویو کی بات آئی ہے تو زندگی کے ہر پہلو کو کھول کر بیان کیا جاتا ہے۔ خصوصاً ایک اخباری رپورٹر کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی لیڈر کے خفیہ گوشوں تک اور دکھتی رنگوں تک پہنچ سکے۔“

خسرو پریشان ہو گیا۔ اب تک ثمینہ کے جلوے میں گم ہو کر جانے کیا کیا سوچتے ہوئے

ثمینہ نے کہہ۔ ”آپ انٹرویو سے پہلے مجھے اپنے گھریلو حالات میں جھانکنے کی اجازت دیں۔ اگر آپ برائے نام تو میں کہوں، آپ اور آپ کے گھروالے ایک نارمل زندگی نہیں گزار رہے ہیں۔ آپ لوگ آئے دن اپنی بہت سی ضرورتوں کو مارتے ہیں۔ آپ کی بہنیں بہت خوبصورت ہیں لیکن ان کے چروں پر ایسی زردی ہے جیسے وہ ضرورتوں کا زہر پی رہی ہوں۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں ہیں مگر دل کٹی نہیں ہے۔ ان کی آنکھوں میں بھارت ہے مگر چمک نہیں ہے۔ ان کی باتوں میں محبت ہے لیکن طعاس نہیں ہے۔ ان کی گفتگو کے دوران کوئی نہ کوئی نقطہ ڈنک مارنے چلا آتا ہے۔ آپ مرد ہیں پھر ہیں۔ آپ اتنی شدت سے محسوس نہیں کر سکتے جتنا کہ میں کر سکتی ہوں۔“

خسرو نے پوچھا۔ ”تم انٹرویو کے سلیبلے میں کوئی سوال کر رہی ہو یا تقریر کر رہی ہو؟“
 وہ مسکرا کر بولی۔ ”اب سوال کر رہی ہوں۔ آپ یہ بتائیں آپ کا ذریعہ آمدنی کیا ہے؟“

”میں ایک چھوٹی سی انٹسٹری کا مالک ہوں۔ ہمارے ہاں قالین تیار ہوتا ہے۔“
 ”آپ کی ماہانہ آمدنی اوسطاً کیا ہوگی؟“
 ”میں کوئی ڈھائی ہزار روپے۔“

”معتقول آمدنی ہے۔ آپ یہ بتائیں۔ کیا آپ کے سیاسی دماغ میں کبھی رومانس کی بات آئی ہے؟“

خسرو ایک دم سے چونک گیا۔ ثمینہ کو شرمنا چاہئے تھا، لیکن اس بات پر وہ شرمائے لگا۔ اس نے کہہ۔ ”آپ کی امی نے بتایا ہے کہ سلیقہ بیگم کا انتقال ہوئے تقریباً نو برس گزر چکے ہیں تب سے آپ نے شادی نہیں کی۔ میں پوچھ سکتی ہوں کیوں نہیں کی؟ کیا کوئی لڑکی پسند نہیں آئی یا آپ شگ مزاج رکھنے والوں میں سے ہیں؟“

”اگر میں جواب دوں کہ مجھے ایک لڑکی پسند آئی ہے تو کیا جواب مکمل ہو جائے گا؟“
 ”سوال اور آگے بڑھے گا۔ آپ یہ بتائیں جسے آپ نے پسند کیا ہے کیا آپ چاہتے ہیں کہ وہ آپ کی نظروں میں بہت خوبصورت نظر آئے؟ اچھی طرح غی بنی رہے۔ اچھا لباس پہنے اور آپ کی آنکھوں کے سامنے رنگ و نور کی برسات ہوتی رہے؟“

”میں سیاست کے معاملے میں شگ ہوں لیکن محبت معرا میں بھی پھول کھلا دیتی ہے

اس سے باتیں کرنا رہا۔ یہ بھول گیا کہ ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے انٹرویو دینے کے لئے بیٹھا ہے، لیکن وہاں تو اس پر رومانیت غالب آگئی تھی۔ وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”کیا تم یہ باتیں اخبار میں شائع کرو گی؟“

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ”میں یہاں کس لئے آئی ہوں؟“

وہ جبراً مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ تمہارے والد سے میرے اچھے تعلقات ہیں اور آج کے اخبار میں تم نے میری حمایت میں بھرپور رپورٹنگ کی ہے۔ میری اپنی ریڈنگ یہ ہے کہ تم مجھے پسند کرتی ہو۔“

ٹھینے نے چونک کر اسے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں پہلے ٹھینے کی نظریں جھک گئیں۔ خسرو نے کہا۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ تم مجھے اس حد تک پسند کرتی ہو کہ اپنے اخبار کے ذریعے میرے نام کو اچھالنا چاہتی ہو۔ ایک دن میں کہہ سکوں گا کہ میری کامیابی میں تمہاری اپنائیت کا بڑا دخل ہے۔“

اب وہ کچھ غیس بول رہی تھی۔ بال بین کو داغوں میں دہائے سر کو جھکائے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ خسرو نے پوچھا۔ ”ہاں تو بتاؤ، اب تک ہمارے درمیان جو باتیں ہوئی رہی ہیں تم اسے اخبار میں شائع کرو گی؟“

ٹھینے نے سر کو جھکائے ہوئے انکار میں سر کو ہلایا۔ پھر ہولے سے بولی۔ ”میں تو مذاق کر رہی تھی۔“

خسرو نے خوش ہو کر کہا۔ ”کیوں نہ ایک سوال تم کو؟ میں جواب دوں۔ دوسرا سوال میں کبھی بغیر تم جواب دوں۔“

ٹھینے نے سوال کیا۔ ”ہمارے ملک کا کوئی سیاسی لیڈر غریب نہیں ہے۔ آپ غریب کیوں ہیں؟“

”میں چاہوں تو راتوں رات امیر بن سکتا ہوں۔ کتنی ہی سیاسی پارٹیاں مجھے خریدنا چاہتی ہیں۔ خود میری پارٹی کے دو تئہ افراد میرے لئے آرام و آسائش مہیا کرنا چاہتے ہیں۔ ڈیفنس میں مجھے ایک کوٹھی دینا چاہتے ہیں۔ میرے لئے ایک کار خصوصی کرنا چاہتے ہیں۔ میرے زندگی کے طور طریقوں کو ہی بدل دینا چاہتے ہیں لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔“

”اب جو سوال کروں گی اس کا جواب نوٹ نہیں کروں گی۔ نہ ہی یہ اخبار میں شائع

ہوگا۔ آپ یہ بتائیں کہ ان دو تئہوں کی پیش کش کو آپ قبول نہیں کرتے۔ اس کے بغیر آپ لیڈر کیسے بنیں گے؟ کیسے آگے بڑھیں گے؟“

”اس وقت میں جس پارٹی سے منسلک ہوں وہ لوگ خود ہی مجھے آگے بڑھانے پر مجبور ہیں۔ پوری پارٹی میں میری طرح کوئی سوٹر انداز میں تقریر نہیں کر سکتا۔ وہ میرے محتاج ہیں۔“

”میں مانتی ہوں۔ آپ میں بڑی خوبیاں ہیں لیکن آپ کو عوام کی حالت سنوارنے سے پہلے اپنی حالت پر بھی غور کرنا چاہئے۔ اپنی زندگی بنانے کے لئے بھی کچھ کرنا چاہئے۔ جب تقریر آپ کو کچھ کرنے، کچھ کہانے، کچھ بن جانے کا موقع دے رہی ہے تو آپ اس سے فائدہ کیوں کرتے ہیں؟ آپ کسی سے ناجائز وعدہ، کچھ نہیں لیں گے بلکہ اپنی محنت کے صلے میں حاصل کریں گے اور محنت کا صلہ لینا نہ تو جرم ہے اور نہ ہی سیوہ کی بات ہے۔“

”سینٹہ ستار بھائی اور سینٹہ غفار بھائی بھی مجھے اسی طرح سمجھاتے ہیں مگر میں اپنے اصولوں کا پکا ہوں۔“

”اپنے اصولوں کا پابند رہنا بڑی اچھی بات ہے لیکن اصول ایسے ہونے چاہئیں کہ اپنی ذات کو کچھ فائدہ پہنچے۔ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے اور اپنی بیوی کو.....“

وہ کہتے کہتے رک مٹی پھر بولی۔ ”ارے ہاں، آپ کی تو بیوی ہی نہیں ہے۔ اگر ہوئی تو مجھے اتنا سمجھانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ کیا ستار بھائی اور کیا غفار بھائی سمجھائیں گے۔ وہ تو ایسے سمجھاتی کہ ساری زندگی آپ اپنے اصولوں کا ماتم کرتے رہ جائے۔ ذرا یہ تو بتائیے وہ لڑکی کون ہے جس کی خاطر آپ کی زندگی کے صحرا میں پھول کھلنے لگے ہیں؟“

ایسا پوچھتے ہوئے اس نے بال بین کو داغوں میں دھپایا۔ خسرو نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ پھر مسکرا کر کہا۔ ”اتنی دیر سے مجھے ایک بھی سوال کرنے کا موقع نہیں ملا۔ تمہارا سوال محفوظ ہے۔ پہلے یہ بتاؤ، تمہاری شادی نہیں ہوئی۔ پھر تمہیں اس بات کا تجربہ کیسے ہے کہ بیویاں اپنے شوہروں کو اصولوں کا پابند رہنے نہیں دیتی؟“

”شادی نہ ہوئی تو کیا ہوا۔ میں دس گھروں میں جا رہی ہوں۔ ہزاروں طرح کے تماشے

دیکھتی ہوں۔ خود میرے ابو شادی سے پہلے بہت ہی اصولوں کے پابند تھے۔ اسنے خدو تھے کہ کسی کی بات کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ جب میری امی ان کی زندگی میں آئیں تو وہ رفت رفت بدلتے چلے گئے۔

”تمہاری عمر کیا ہوگی؟ دیکھو، سچ بولنا۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”جہاں اپنا نقصان نہ ہو وہاں ہمیشہ سچ بولنا چاہئے۔ ایک محترمہ اپنے صاحبزادے کے لئے میرا رشتہ مانگنے آئی تھیں۔ امی ان سے میری عمر چھپانا چاہتی تھیں کہنا چاہتی تھیں کہ میں کوئی سترہ اٹھارہ برس کی ہوں لیکن میں شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے محترمہ کے کالوں میں چپکے سے یہ بات چھوٹک دی کہ میری عمر چھبیس برس ہے۔“

”کیا واقعی تم چھبیس کی ہو؟“

اس نے ہنستے ہوئے کہہ۔ ”یہ پچھلے برس کی بات ہے آپ ایک برس اور جوڑ لیں۔“

”کمال ہے تم ستائیس برس کی ہو لیکن سترہ برس کی لگتی ہو۔“

وہ مسکراتی رہی۔ دانتوں تلے ہل چن کو دہائے شوخی سے اسے دیکھتی رہی۔ اسنے میں خسرو کی بڑی بہن ناشتے اور چائے کی ٹرے لے کر آئی۔ ان کے سامنے ایک چھوٹی سی پتائی پر ٹرے کو رکھ دیا۔ ثینہ نے پوچھا۔ ”تمہارا نام عذرا ہے؟“

”جی ہاں۔“

”آؤ بیٹھو، ہمارے ساتھ ناشتہ کرو۔“

”میں ہلکی! آپ دونوں کام کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہاں میری موجودگی غیر ضروری ہے۔ جب آپ کا انٹرویو ختم ہو جائے تو ہم آپ سے خوب باتیں کریں گے۔“

وہ مسکراتے ہوئے چلی گئی۔ خسرو نے مٹھائی کی ڈش اس کی طرف پڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ابھی تک انٹرویو جاری تھا یا شروع ہونے والا ہے یا اگر ختم ہو چکا ہے تو تم نے کیا پوچھا اور میں نے کیا جواب دیا؟“

وہ کھکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔ ”میں چائے سے پہلے ٹمکین کھاتی ہوں۔ مٹھائی کا شکر۔“

وہ کچھ ٹمکین چیزیں کھانے کے بعد چائے پینے لگی۔ خسرو نے کہہ۔ ”لاکیاں اتنی عزیز

تک کھڑیں بیٹھی رہ جائیں تو میں باپ پریشان ہو جاتے ہیں۔ تمہارے والدین تو خاصے پریشان ہوں گے؟“

”پہلے میں کچھ بنا چاہتی تھی پھر شادی کرنا چاہتی تھی اس لئے شادی سے انکار کرتی تھی۔ اب مجھے عمر رسیدہ سمجھا جاتا ہے اس لئے رشتے نہیں آتے۔“

”اپنی عمر چھپانا کوئی بری بات تو نہیں ہے۔“

”جو میری عمر کا قریب کھا کر مجھے شریک حیات بنائے گا، میں اسے اسحق سمجھتی رہوں گی۔ پھر بھلا ایک احسن کے ساتھ خوشگوار زندگی کیسے گزار سکوں گی؟“

اس نے چائے ختم کی۔ خلل پائی کو ٹرے پر رکھتے ہوئے کہہ۔ ”آپ نے ویر سارے سوالات کر لئے۔ اب مجھے اخبار کے لئے کچھ سوال کرنے دیں۔“

”اتنی دیر سے تو کیا ہو رہا ہے کہ سوال اخبار کے لئے شروع ہوتا ہے لیکن میرے جواب پر تم میری ذاتی زندگی میں جھانکنے لگتی ہو۔ ٹھیک ہے۔ اب ہم غلط رہیں گے۔ تمہارا سوال کیا ہے؟“

ثینہ نے اپنی کاپی اور بال پین کو سنبھالتے ہوئے کہہ۔ ”کسی ماہر نفسیات نے کہا ہے، جو لوگ دوسروں سے اپنے آپ کو چھپانا چاہتے ہیں وہ کبھی اپنا مکمل نام ظاہر نہیں کرتے۔ ایسا وہ غیر شعوری طور پر کرتے ہیں۔ چند حروف کے پیچھے اپنے نام کا زیادہ حصہ چھپا لیتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کر رہے ہیں۔ یہ اے جی خسرو کا مطلب کیا ہوتا ہے؟“

”عبدالغفار خسرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں دوسروں سے کچھ نہیں چھپاتا۔ اب دوسرے یہ سمجھتے ہوں تو دوسری بات ہے۔“

ثینہ نے مسکرا کر کہہ۔ ”تھوڑی دیر پہلے آپ نے میرے ایک سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ جواب آپ پر ادھار ہے۔“

خسرو نے جواباً مسکرا کر کہہ۔ ”شاید میں تھوڑی دیر بعد جواب دے سکوں۔“

”تھوڑی دیر بعد کیوں؟“

”ابھی اپنے اندر حوصلہ پیدا کر رہا ہوں۔“

ثینہ نے پوچھا۔ ”آپ کی بیگم مرحومہ آپ کو آدمی نام سے پکارتی ہوں گی یا آئندہ جو لڑکی شریک حیات بن کر آئے گی وہ بھی آپ کو آدمی نام سے پکارے گی؟“

خسرو نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ آدھا نام کیا ہوتا ہے؟“

وہ خوشی سے مسکرا کر بولی۔ ”اے جی! بیٹھے جی!“

خسرو نے کھل کر ایک قہقہہ لگایا۔ ٹینہ ہال چین کو دانوں تلے داب کر مسکرا رہی تھی۔ اچانک اس کا قہقہہ رک گیا۔ اچانک اس کے اندر حوصلہ پیدا ہوا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر ٹینہ کے ہاتھ پر رکھ کر اس ہال چین کو قہقہہ لیا۔ ٹینہ نے ہڑبڑا کر ہال چین کو چھوڑ دیا۔ اس کا منہ حیرانی سے کھل گیا۔ خسرو نے اس ہال چین کو لے کر بڑے پیار سے دیکھا پھر کہا۔ ”کوئی لڑکی دوپٹے کا کونا دانوں سے دبائے یا دھوٹھا چوسے یا ہال چین کو منہ میں دبا کر رکھے اور گفتگو کرتی رہے تو یہ میری بہت بڑی کمزوری بن جاتی ہے۔“

ٹینہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ خسرو نے اچانک ہی پوچھا۔ ”کیا تم مجھے 'اے جی' کہتا پسند کرو گی؟“

ٹینہ کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ وہ چند ساعتوں کے لئے ساکت رہی۔ پھر ایک دم سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اپنے سر پر آئینہ کو منہ لاتی ہوئی حیرت سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔

خسرو نے پریشان ہو کر سوچا۔ شاید وہ ناراض ہو گئی ہے۔ شاید اس نے بے باکی سے یہ پوچھ کر غلطی کی ہے۔ اب وہ انٹرویو کے لئے واپس نہیں آئے گی۔ شاید گھر سے نکل کر چلی گئی ہے لیکن اس کا خیال غلط نکلا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز دوسرے کمرے سے سنائی دی۔ وہ اس کی بہنوں کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ پھر ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ اس کی بہنوں کی ہنسی کے ساتھ اس کی ہنسی بھی شامل تھی۔ تب خسرو کی جان میں جھنجھکی آئی۔

دوسرے دن اس نے روزنامہ اتحاد کے دفتر میں فون کیا دوسری طرف سے کسی نے رہیور اٹھا کر پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”میں 'اے جی' خسرو بول رہا ہوں اور میں ٹینہ دزانی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

اسے انتظار کرنے کے لئے کہا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹینہ کی حزنم آواز سنائی دی۔

”ہیلو! آپ خسرو صاحب ہیں؟“

”میں وہی ہوں جس سے تم منہ پھیر کر چلی گئی تھیں۔“

دوسری طرف خاموشی رہی۔ خسرو نے کہا۔ ”میری امی تمہارے گھر گئی ہیں۔“

ٹینہ نے انجان بن کر پوچھا۔ ”کیوں گئی ہیں؟“

”تمہیں مانگنے کے لئے۔“

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر ٹینہ نے کہا۔ ”آپ تو بہت تیزی دکھا رہے ہیں۔ پرسوں آپ نے مجھے دیکھ کر کھل باتیں کیں اور آج اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔“

”میں نے تیزی نہیں دکھائی بلکہ دیر کر دی۔ میں نے نو سال کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔ آج تم پورے ستائیس برس کی ہو۔ میں نے بہت دیر کر دی۔ نو برس پہلے جب تم اٹھارہ برس کی تھیں تب ہی تمہارے گھر آکر مجھے تمہارا ہاتھ مانگ لیتا چاہتے تھے اور تم کہہ رہی ہو کہ تیزی دکھا رہا ہوں۔“

”آپ بڑی خوبصورتی سے باتیں بنا رہے ہیں لیکن ان تین دنوں میں ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ہم کس حد تک ہم مزاج ہیں۔“

”ہلو! آج شام کیسے بیٹھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔ بولو! کہاں مل سکتی ہو؟“

ٹینہ نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”شام کو سات بجے کارساز کے کسی اوپن ایئر ریسٹوران میں مل سکتی ہوں لیکن وہاں کھانے کا بل میں ادا کروں گی۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بل میں ادا کروں گا۔“

”آپ اپنے اصول کے پابند ہیں۔ مگر چیزیں خرید کر کھانے کے خلاف ہیں۔ ایسے ریسٹوران میں گوشت بہت مہکا ہوتا ہے۔ نہیں خسرو صاحب! بل میں ادا کروں گی۔“

خسرو مشکل میں پڑ گیا۔ اپنی محبوبہ سے پہلی بار کہیں آزادی سے ملاقات ہونے والی تھی۔ بھلا یہ کیسی بات ہوئی کہ کھانا وہ کھانا اور بل وہ ادا کرتی۔ بڑی سبکی ہوئی۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”فون پر یہ بحث مناسب نہیں ہے۔ ہم وہاں ریسٹوران میں ملے کر باتیں کریں۔ ٹھیک سات بجے۔“

یہ کہہ کر اس نے رہیور رکھ دیا۔ پارٹی کے دفتر میں سب لوگ بیٹھے اس کا منہ تک رہے تھے۔ سینہ ستار بھائی نے کہا۔ ”اے بابا! اپنے مغز میں بات آگئی ہے۔ تمہاری امی جی ٹینہ کو مانگنے اس کے گھر گئیں اور تم ٹینہ سے ریسٹوران میں ملنے جاؤ گے۔ یہ بتاؤ“

شاری کب بتاؤ گے؟

کرتے ہیں۔ میں نے پہلے ہی فیصلہ کیا ہے۔ نہ آپ لوگوں کا احسان لوں گا نہ انکیشن میں کامیاب ہونے کے بعد آپ لوگوں کے دباؤ میں آؤں گا۔

صدرانی نے ناگواری سے کہا۔ ”مسٹر خسرو! آدمی کو بڑا بول نہیں بولنا چاہئے۔ کل کے اخبارات نے تمہیں مغرور بنا دیا ہے۔ یہ کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ آنکھوں انکیشن میں تم ہماری پارٹی کے پلیٹ فارم سے کامیاب ہو سکو۔“

”کامیابی اور ناکامی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔“
یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا دفتری کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی، پھر سینہ ستار بھائی نے قہقہے سے کہا۔ ”صدرانی بھائی! اس سے ٹھٹھا ہو کر بولا کرو۔ وہ ہماری پارٹی کا بہت مضبوط کھمبا ہے۔ جلسے میں بہت زور سے تقریر بولتا ہے۔ اس کو ہم لوگ پنڈل کرے گا۔ کیسے کرے گا؟ یہ تم چپ چاپ دیکھتے جاؤ۔“

یہ کہہ کر اس نے ریسپورڈ اٹھایا۔ پھر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس کے بعد ریسپورڈ کو کان سے لگا کر سننے لگا۔ دوسری طرف سے کسی نے پوچھا۔ ”آپ کون ہو؟“
”میں سینہ ستار بھائی بول رہا ہوں۔ رپورٹر اور فونو گرافر شینہ درانی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد شینہ کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو! آپ کون ہیں۔ مجھ سے کیوں بات کرنا چاہتے ہیں؟“

”ہیلو! شینہ بائی! میں سینہ ستار بھائی ہوں۔ پرسوں جلسے میں اسٹیج کے اوپر میں بیٹھا ہوا تھا۔ تم نے خسرو صاحب کے ساتھ میرا ایک فوٹو بھی بنایا تھا۔ یاد آیا؟“

”میں نے آپ کا نام سنا ہے۔ آپ کو دیکھا بھی ہے“ فرمایا۔
”کیا فرماتا ہے بیٹی! میں تم کو جینی سمجھتا ہوں۔ جب سے خوشخبری سنی ہے میں خوشی کے مارے ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتا ہوں۔“

”آپ نے کون سی خوشخبری سنی ہے؟“
”وہی اپنے کھسرو بھائی والی۔ کھسرو بھائی اسی دفتر سے ابھی فون پر تم سے بولا تھا۔“
”آپ خوش ہونے میں تیزی دیکھا رہے ہیں۔ بات ابھی طے نہیں ہوئی ہے۔“
”ہم کو سب معلوم ہے۔ آج ریسٹوران میں بات پکا ہونے کو ہے۔“

خسرو نے ایک بھر پور انگڑائی لی۔ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھے۔ پھر چست کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرا تو جی چاہتا ہے‘ شادی آج ہو جائے‘ ابھی ہو جائے۔ دیکھیں بات کب بنتی ہے۔“

پارٹی کے جنرل سیکرٹری نے کہا۔ ”درانی صاحب آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ہم سب سے بھی اچھی واقفیت ہے۔ ہم اگر زور لگائیں تو شادی ایک مہینے میں بلکہ ایک ہفتے میں ہو سکتی ہے۔“

سینہ غفار بھائی نے کہا۔ ”بات ہم بتائیں گے اور اپنی طرف سے بھی درانی صاحب کو مجبور کریں گے۔ بڑی دھوم دھام سے شادی ہوگی۔“

خسرو نے کہا۔ ”بھئی سینہ صاحب! یہ دھوم دھام والی بات نہ کریں۔ شادی تو میں بڑی سادگی سے کروں گا۔“

سینہ ستار بھائی نے کہا۔ ”وہی کھسرو صاحب! تم ہر مایہ میں اپنی ہی بات چلاتے ہو۔“

”میں کتنی بار سمجھا چکا ہوں۔ اچھی نہیں اے‘ جی اور کھسرو نہیں‘ خسرو۔“
”چلو بابا! وہی نام ہے جو تم بولتے ہو۔ مگر یہ شادی کے مایہ میں ہم لوگ اپنا سن مانی کریں گے۔ تم کچھ نہیں بولو گے۔ تم دو لہا ہو‘ چپ چاپ رہو گے۔“

خسرو اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ کمرے میں شلے لگا۔ پارٹی لیڈر عبدالجبار صدرانی نے کہا۔ ”مسٹر خسرو! تم مگر میں گوشت نہیں کھاتے ہو‘ لیکن شادی کے دن تو گوشت کھانا ہی ہو گا۔ چاہے کتنا ہی سنگاٹے۔“

سینہ غفار بھائی نے کہا۔ ”اے صدرانی بھائی! تم سنگٹائی کی بات مت بولو۔ ہمارے خسرو صاحب کو کس بات کی کمی ہے اور وہ بھی ہمارے ہوتے ہوئے۔“

خسرو نے کہا۔ ”میں آپ لوگوں کے طریقے کار کو خوب سمجھتا ہوں۔ آپ لوگ جس طرح کاروبار میں بڑی بڑی رقم لگاتے ہیں اسی طرح لیڈروں پر اپنی دولت لٹاتے ہیں۔ جب وہ کامیاب ہو کر حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں تو اپنی رقم بڑے بڑے سرکاری ٹھیکوں اور درآمدی و برآمدی لائسنسوں کی صورت میں سود و سود حاصل کرتے ہیں۔ ان سے کروڑوں روپے کے جائز اور ناجائز کاروبار یکم لئے مراعات حاصل

ہیں۔ آپ عوام کے رہنما ہیں۔ قلم پر ہم سب کا حق ہے۔ ہم آپ کی تصویریں انارکیتے ہیں۔ ہم آپ کی تصویروں کو ڈرائنگ روم میں سجاسکتے ہیں۔“

خسرو نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم مجھے کیسے جانتے ہو؟“
اس نے مسکرا کر کہا۔ ”وہاں جناب! اخبار والے کے نہیں جانتے میرا تعلق کتنے ہی اخباروں سے ہے۔“

ثمینہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آگئی تھی۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”اب تو ہمارا اسکیڈل بنے گا میں انہیں جانتی ہوں۔ یہ مسٹر نواز ہیں۔ فری لانسر ہیں۔ بڑے اہم مواقع کی تصویریں انارکیتے ہیں اور اخبار والوں سے منہ مانگی قیمت وصول کرتے ہیں۔“
خسرو نے غصے سے نواز کو دیکھا۔ پھر عقل آگئی کہ غصہ دکھانے کا وقت نہیں ہے۔
لونا جھگڑا بدنامی کا باعث ہو گا۔ اس نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”مسٹر نواز! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں! آپ اس تصویر کو ضائع کر دیں۔“

”جناب! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ کی مخالف پارٹیوں کے لوگ اس تصویر کی قیمت ہزاروں میں دے سکتے ہیں پانچ ہزار! دس ہزار! شاید بیس ہزار بھی۔“
اسے اچھی خسرو نے سر جھکا کر کچھ سوچا پھر کہا۔ ”جب مخالف پارٹیوں کی بات آگئی ہے تو کوئی بات نہیں ہے۔ جاتے ہو خود دار! منہ مانگی قیمت پر فروخت کرو۔ ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ چار تصویریں اور انارکیتے۔“

ثمینہ نے حیرانی سے کہا۔ ”آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟“
”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ آؤ! چلو ہم اپنی جگہ بیٹھیں۔“

اس نے ثمینہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ میز تک آیا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے اس نے اس ہاتھ کی نرمی اور گرمی کو خوب محسوس کیا۔ ثمینہ اپنی پریشانی میں تھی۔ پہلے تو اس نے محسوس نہیں کیا۔ میز کے قریب پہنچ کر خیال آیا کہ اس کا ہاتھ خسرو کے ہاتھ میں ہے۔ اسے بڑا اچھا لگا۔ شرم آ رہی تھی اور ہاتھ چھڑانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ یوں اس طرح ہاتھ سے ہاتھ دیئے کھڑے رہتا بھی بے حیائی تھی۔ اس کے سوچتے سوچتے پھر غلبہ لائٹ بجلی کی طرح چٹکی لاد رہی تھی۔

نواز نے دوسری بار اہم موقع کی تصویر انارکیتے ثمینہ نے ایک دم سے گھبرا کر اپنا

”عجب ہے۔ ابھی میاں بڑی پوری طرح راضی نہیں ہوئے ہیں اور آپ لوگوں نے اس حد تک معلومات حاصل کر لی ہیں۔“

”جی! سمجھ لو کہ یہ اپنے ہی گھر کا مایہ ہے۔ میں ابھی تم سے ملنا مانگتا ہوں۔ دس منٹ کے لئے یا پھر وہ منٹ کے لئے میرے سے بات کرو۔ میں تم کو بہت اچھی بات بولنا چاہتا ہوں بہت اچھی بات۔ تم جب تک جیتی رہو گی اپنے ستار بھائی کو یاد کرتی رہو گی۔“
”اچھی بات ہے۔ میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہتی ہوں۔ آجائیے۔“

دوسری طرف سے رابطہ ختم ہو گیا۔

اسے اچھی خسرو جی بی بی سی ریسٹوران میں پہنچ گیا تھا۔ ایک کرسی پر بیٹھ کر سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے آنے والی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ ثمینہ ٹھیک سات بجے نظر آئی۔ اس نے مٹی بس سے اترتے ہی خسرو کو دیکھ لیا تھا۔ وہ سیدھی اس کی طرف آئی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

وہ حیرانی سے بولی۔ ”لیکن میں نے تو سات بجے کا وقت دیا تھا اور ٹھیک وقت پر یہاں آئی ہوں۔ آپ اسے معجزہ ہی سمجھیں ورنہ بس میں ستر کرنے والے کبھی وقت پر کہیں نہیں پہنچتے۔“

وہ میز کے دوسری طرف بیٹھ گئی۔ خسرو نے وہ ٹھنڈی بوتلوں کا آرڈر دیا۔ ثمینہ نے کہا۔ ”اپنی ذاتی گاڑی نہ ہو تو بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ ابو کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر دفتر جاتی ہوں۔ وہی مجھے دفتر سے کھیلے جاتے ہیں۔ اب ان سے یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس وقت آپ سے ملنے جا رہی ہوں۔“

”انہوں نے پوچھا تو ہو گا؟“

”جی ہاں! میں نے انہیں سہیلی کے گھر کا پتہ بتا دیا وہ مجھے وہاں چھوڑ گئے۔ وہاں سے مٹی بس میں بیٹھ کر آئی ہوں۔“

اسی وقت ایک غلیظ لائٹ چٹکی اور بجھ گئی۔ خسرو نے چونک کر اُدھر دیکھا۔ ایک شخص نے ان کی تصویر انارکیتے تھی۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”یہ کیا حرکت ہے۔ تم نے ہماری اجازت کے بغیر تصویر کیوں انارکیتے ہے؟“

اس شخص نے مسکرا کر کہا۔ ”جناب خسرو صاحب! آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔“

”میں بھی دوسری عورتوں کی طرح خواہ مخواہ ہر بات پر ضد نہیں کروں گی۔ اپنی ہر بات منوانے کی کوشش نہیں کروں گی۔“

”یقیناً تم ذہین، نگہور اور سلیقہ شعار بیوی ثابت ہو گی۔“

”ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ ابو ہمارے رہنے کے لئے سوسائٹی میں ایک چھوٹی سی کوشش دینا چاہتے ہیں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں شادی سے پہلے یا شادی کے بعد بھی سسرال سے کوئی چیز نہیں لینا چاہتا۔“

”یہ آپ کا اصول ہے کہ آپ سسرال سے کچھ نہیں لینا چاہتے لیکن دنیا کا دستور ہے لڑکی اپنے ساتھ چیز لے کر آتی ہے۔ میں اپنے چیز میں کوشش اور کار و فیرو لے کر آؤں گی۔“

”لیکن میں چیز کی رسم کے خلاف ہوں۔“

”آپ تو گوشت کے خلاف ہیں۔ آپ شادی میں اچھا پننے اور اچھا کھانے کے خلاف ہیں۔ آپ چیز کے بھی خلاف ہیں۔ آپ قدم قدم پر مخالفت کرتے رہیں گے تو ازدواجی زندگی کیسے گزاریں گے؟ جائز باتوں کو تسلیم کرنے کے لئے کبھی اصولوں سے ہٹا پڑے تو آدمی کو ہٹ جانا چاہئے۔ کوئی راضی خوشی چیز دیتا ہے تو اس میں اعتراض کی بات نہیں ہے۔ البتہ لڑکی والوں سے جبراً چیز حاصل کرنا ظلم ہے۔ آپ میرے والدین پر ظلم نہیں کر رہے ہیں۔ یہ راضی خوشی کی بات ہے لیکن آپ ہماری خوشی پر ہی اعتراض کر رہے ہیں۔ اگر اسی طرح ہر بات پر اعتراض کرتے رہیں گے تو بات کیسے بنے گی؟“

وہ اپنی کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ دغیر کھانے کی ڈش لاکر رکھ رہا تھا۔ جب وہ چلا گیا تو اس نے کہا۔ ”جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے تمہارے والد کی مالی پوزیشن ایسی نہیں ہے کہ وہ سوسائٹی میں ایک کوشش خرید سکیں اور چیز میں کار و دے سکیں۔“

”آپ نہیں جانتے جب میں پیدا ہوئی تھی تب ہی سے میرے والدین نے تھوڑا تھوڑا جوڑنا شروع کیا تھا۔ اتنی رقم بچاؤ ہے اور میرے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ آپ چیز کا سلمان دیکھیں گے تو دیکھ رہ جائیں گے۔ سوسائٹی میں انہوں نے بہت پہلے ہی میرے لئے

کوشش ہوئی تھی۔ کار اب خریدنے والے ہیں۔“

”لیکن شینہ! میں سسرال والوں کا اعادہ احسان نہیں اٹھا سکتوں گا۔“

”آپ کسی سیاسی پارٹی کا احسان نہیں اٹھا رہے ہیں اور سسرال والوں کا احسان ہی کیا ہے۔ وہ تو میں چیز لے کر آ رہی ہوں۔ آپ پر کسی قسم کا دباؤ نہیں پڑے گا۔ اگر آپ کو ناگوار گزرے اور میں بھی آپ کو طعنے دوں تو آپ بے شک وہ سارا چیز میرے منہ پر پھینک دیجئے گا۔ میں کوئی جاہل عورت نہیں ہو کہ ایسا موقع آئے دوں گی۔ کبھی آپ ناراض ہوئے اور میں نے یہ دیکھ لیا کہ میرا چیز آپ کی ذاتی پریشانی کا باعث بن گیا ہے تو میں آپ کے سامنے ہی اپنی کوشش اور کار کو آگ لگا دوں گی۔ آپ میری محبت کو دور میری.....“

وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ سر جھکا لیا۔ شرماتے لگی۔ خسرو کو اس کی یہ ادا بہت اچھی لگی۔ وہ اسے بڑی محبت سے دیکھنے لگا وہ چند لمحوں کے بعد آہستگی سے بولی۔ ”کھانا کھڑا ہو رہا ہے۔“

وہ کھانے لگے۔ کھانے کے دوران تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر شینہ نے کہا۔ ”آج میں ایک اہم بات طے کر لینا چاہتی ہوں۔“

”کوئی ایسی بات کتنا جو میرے ذہن پر بوجھ نہ بنے۔“

”میں جائز بات کہوں گی۔ آپ اسے جائز تسلیم نہ کریں تو یہ آپ کی زیادتی ہو گی۔“

”تم کو تو؟“

”شادی کے بعد گھر کی تمام ذمہ داریاں عورت پر ہوتی ہیں اور باہر کی تمام ذمہ داریاں مرد پر۔“

”بے شک یہ ہونا بھی چاہئے۔“

”میں چاہتی ہوں کہ جب میرے سر پر ذمہ داری آئے تو میں صرف اپنے آپ کو نہ دیکھوں، آپ کے والدین کو، آپ کے بھائیوں کو، آپ کی بہنوں کو اپنا سمجھ کر ان کے مستقبل کو شائد ار بنانے کی کوشش کروں۔“

”تم بہت اچھی ہو، میرے منہ کی بات کہہ رہی ہو۔“

”لیکن آپ اپنے ہی منہ کی بات دہرائیں لے لیں گے جب میں آپ کی بہنوں کو

اجتے لباس پہناؤں گی۔ اپنے ساتھ شادی وغیرہ کی تقریبات میں لے جاؤں گی۔ انہیں بلا سائیک اپ کراؤں گی۔ آپ نہیں جانتے، جب تک کنواری لڑکیوں کو سجاایا کر نہ رکھا جائے اس وقت تک رشتے نہیں آتے اور یہ صرف رشتے کی بات نہیں ہے۔ ایک اچھی ہنسی بولتی، میااری زندگی گزارنے کے لئے لازمی ہے کہ ہمارے ساتھ آپ کی بہنیں بھی ہنسی بولتی رہیں۔ آپ مجھے اچھا سمجھتے ہیں۔ ابھی میری تقریباتیں کر رہے ہیں اور میرے خلوص پر کسی قسم کا شبہ نہیں ہے تو آپ کو میری بات مان لینا چاہئے اور اپنے گھروالوں پر سے موجود پابندیاں ختم کر دینا چاہئیں۔

وہ چپ چاپ کھاتے ہوئے سوچنے لگے بار بار دماغ میں یہ خیال آ رہا تھا کہ شادی کی بات کو ابھی کچھ عرصے کے لئے چل دینا چاہئے۔ اس مسئلے پر ابھی طرح غور کرنا چاہئے اور اپنے جذبات کا حساب کرنا چاہئے کہ ٹینڈ کی ضرورت کس حد تک ہے۔

کھاتے کھاتے اچانک اسے خیال آیا کہ شادی کی بات کو وہ چل نہیں سکتا۔ شادی کا فیصلہ ابھی اس میز سے اٹھنے سے پہلے ہو جانا چاہئے اور کل کے اخبارات میں اس کی خبر شائع ہونی چاہئے ورنہ وہ تصویریں زبردست دھماکہ ثابت ہوں گی۔ اس کے سیاسی کیریئر کو تباہ کر دیں گی۔

اس نے کہل۔ ”اگر میں بوجھ بن رہی ہوں تو مجھے دماغ سے نکل دیجئے۔“
”یہ بات نہیں ہے ٹینڈ! میں چاہتا ہوں اس مسئلے پر ابھی غور کیا جائے۔ اتنی جلدی فیصلہ کرنا دانشمندی نہیں ہوگی، لیکن وہ تصویریں میرے لئے مصیبت بن گئی ہیں۔ کل شادی کا اعلان نہ ہوا تو میں بری طرح بدنام ہو جاؤں گی۔“

ٹینڈ نے بڑے ہی دکھ بھرے انداز میں کہل۔ ”کتنے افسوس کی بات ہے، آپ محض بدنامی کا خیال کرتے ہوئے میری ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں کہ آپ دل کی گہرائیوں سے مجھے اپنا چاہتے ہیں اور میرے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہیں۔“

”میں بالکل تمہیں اپنا چاہتا ہوں اور دل کی گہرائیوں سے اپنا چاہتا ہوں۔ تمہارے لئے قربانیاں بھی دے سکتا ہوں مگر کچھ سوچنا سمجھنا تو چاہئے۔“

ٹینڈ نے جمل کر کہل۔ ”آپ کے پاس تو سوچنے سمجھنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے۔ حوصلہ

کر میں سمجھتی تو اخبارات میں شائع ہونے والی تصویروں سے ڈرتے رہیں گے۔ آپ نے لیڈر بن کر اپنے آپ کو بڑا بنا لیا ہے۔ دنیا میں اور بھی تو لیڈر ہیں کتنی پہاکی سے پیادت دیتے ہیں۔ کتنی بے باکی سے سپرد تفریح کرتے ہیں۔ قیمتی کاروں میں گھومتے ہیں۔ شاندار کوفیوں میں رہتے ہیں۔ کوئی ان کا محاسب نہیں کرتا۔ آپ دنیا سے نرالے ہیں؟“
وہ کھیلی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ”تم تو ابھی سے بیوی کی طرح لڑنے لگی ہو۔“
اسی وقت دینر نے آکر پوچھا۔ ”اور کچھ چاہئے جناب؟“
ٹینڈ نے کہل۔ ”نہیں بلے آؤ۔“

وہ ڈشیں سمیٹ کر چلا گیا۔ ٹینڈ نے کہل۔ ”اگر ہماری شادی کا اعلان ہو جائے اور اس کے بعد وہ تصویریں شائع ہوں تب بھی آپ بدنام ہو جائیں گے۔“
”خسرو نے حیرانی سے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

”ایسے کہ اس نے اوپن ایئر ریسٹوران میں ہماری تصویریں اتاری ہیں۔ آپ گوشت جیسی مٹکی چیزیں کھانے کے خلاف ہیں۔ یہاں اس مٹکے ہوٹل میں میرے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ آپ اخبارات میں تردید بیان کیا دیں گے۔“
خسرو نے اپنے سر کو تھام کر کہل۔ ”بیوی مصیبت ہے۔ میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا۔ مجھ جیسے آدمی کو بہت غلام رہنا چاہئے تھا۔“

”میں نے آپ کو یہاں آنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ آپ سے مشورہ لیا تھا۔ آپ راضی ہوئے تو میں آئی ہوں۔“
”میں تمہیں الزام نہیں دے رہا ہوں۔“

”پھر اس طرح کیوں بچھتا رہے ہیں جیسے میرے ساتھ آکر گنگار بن گئے ہوں۔ کیا مجھے اپنی توہین کا احساس نہیں ہو رہا ہے؟“
اس نے جلدی سے کہل۔ ”ارے نہیں، تم تو خواہ مخواہ کی باتیں سوچنے لگی ہو۔ تمہارے ساتھ بیٹھ کر میں بہت خوش محسوس کر رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرسوں کے بعد میری زندگی میں بہار آئی ہے۔“

”پھر بہاروں کے جموگے محسوس کرتے ہوئے سوچنے پریشانیوں کو دل دماغ سے نکل دیجئے۔ جو لوگ اپنے گھر میں کچھ اور طرح سے زندگی گزارتے ہیں۔ باہر کچھ اور

طرح سے "انہیں بار بار اپنے بیانات بدلنے پڑتے ہیں۔ آپ تردیدی بیان میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو تصویریں ہماری اتاری گئی ہیں وہ اوپرین لیئر ریسٹوران میں منگنی کی رسم کی تصویریں ہیں۔ وہاں اور بھی رشتے دار تھے جو تصویروں میں نظر نہیں آ رہے ہیں۔ منگنی اور شادی بیاہ کے موقع پر منگا کھانا کھایا جاتا ہے۔"

اسے محسوس ہوا جیسے وہ خود کچا در کچا زنجیروں میں جکڑا جا رہا ہے۔ جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس میں ٹمینہ کا قصور نہیں تھا۔ ٹمینہ نے اسے جبراً ریسٹوران میں آنے اور کھانے کے لئے نہیں کہا تھا اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ کوئی آکر ان کی تصویریں اتارے۔ عورت جب کسی سے محبت کرتی ہے تو اسے کسی طرح کی تکلیف نہیں پہنچاتی۔ اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتی ہے۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ چاہتے والے کی جذباتی غلطیوں سے ہوتا ہے۔ ایک طویل عرصے بعد ٹمینہ اس کی اتنی اہم ضرورت بن گئی تھی کہ اس ضرورت کو مہل نہیں سکتا تھا غلطیوں کر سکتا تھا۔

دبغڑیل لے کر آگیا۔ ہانڈے روپے پچاس پیسے کا بل تھا۔ ٹمینہ اپنا پرس کھولنے لگی۔ خسرو نے جلدی سے کہا "یہ کیا کر رہی ہو ٹھہر جاؤ۔"

اس نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر بل کے ساتھ رکھ دیا۔ اس نے کبھی کبھار منگا کھانا ضرور کھایا تھا لیکن آج پہلی بار منگئے کھانے کا بل خود ادا کر رہا تھا۔

ٹمینہ نے دبغڑیل سے کہا "ہاں رکھ لو۔"

پہنر شکر یہ ادا کر کے چلا گیا۔ خسرو کو اٹھنا چاہئے تھا لیکن وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ یہ تو سراسر فضول خرچی تھی۔ سات روپے آٹھ آنے خواہ خود ٹپ دی گئی تھی مگر کدے بڑے بڑے ہو گلوں میں ایسا ہوتا ہے۔

ٹمینہ نے اپنے پرس سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "دیکھیے! میں آپ پر نہ تو بوجھ دینا چاہتی ہوں نہ آپ کے مزاج کے خلاف کوئی کام کرنا چاہتی ہوں۔ جب بھی ایسا کوئی کام کروں گی تو وہ میری کمائی سے ہو گا۔ موجودہ سوسائٹی میں یہ ہماری مجبوریوں ہیں۔ ایسا ہوتا ہے لیکن میں آپ کی کمائی کا ایک پیسہ بھی ضائع نہیں کروں گی۔ پلیز یہ سو روپے رکھ لیجئے۔"

خسرو نے ایک گہری سانس لی۔ ٹکست خوردہ انداز میں ٹمینہ کو دیکھا۔ پھر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "یہ نوٹ اپنے پاس رکھ لو اپنا ہاتھ میرے پاس چھوڑ دو۔"

☆-----☆-----☆

ہو؟

”دبی کر رہی ہوں جو میرا فرض ہے۔ سب سے پہلے میں آپ کے والدین کو آرام پہنچاؤں گی۔ کیا آپ مجھے میرے فرض کی ادائیگی سے روکیں گے؟“

”یہ بات نہیں ہے۔ جو مجھے کرنا چاہئے وہ تم دلہن بن کر آنے سے پہلے کر رہی ہو۔ یہ محبوب کی بات ہے۔ مجھے شرم آتی ہے۔“

”اس لئے آئی ہے کہ آپ نے چٹائی کو سادہ زندگی سمجھ لیا۔ خود بھی تکلیفیں برداشت کرتے رہے۔ اپنے بھائی بہنوں اور بوڑھے والدین کو بھی اس پر مجبور کرتے رہے لیکن میری موجودگی میں ایسا نہیں ہو گا۔ میں آپ کی شریک حیات بن کر آنے سے پہلے یہاں کے ماحول کو بدل دوں گی۔“

”تم نے تو یہ کہہ کر مجھے پابند کر دیا ہے کہ میری کمائی کا ایک پیسہ ضائع نہیں کرو گی۔ سب اپنی کمائی سے کرتی رہو گی لیکن یہ اچھا نہیں لگتا کہ عورت کی کمائی سے میرا گھر چلے۔“

”آپ یہ بتائیں‘ میری کمائی کس گھر میں جائے گی؟ میرے بچے میں یا اس گھر میں جو بیوہ کے لئے میرا ہونے والا ہے؟“

”تمہاری حرکتیں مجبور کر رہی ہیں کہ میں اپنے گھر کے لئے کچھ فرنیچر خریدوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے جناب! میں نے آپ سے کہہ دیا ہے۔ چیزیں اتنا فرنیچر اتنا سامان لاؤں گی کہ ایک نکاحی خریدنے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور مجھے اگلے ہفتے میرے ایک کزن امریکا سے آرہے ہیں۔ میرے ایک اکل اسلام آباد میں ڈسٹرکٹ میڈیکل آفیسر ہیں وہ بھی اگلے ہفتے آرہے ہیں۔ اکتوبر کو ہمارے ہاں اور بھی اہم رشتے داروں کی گیدرنگ ہے۔ وہ سب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کچھ باتیں کریں گے۔ اب آپ فرمائیں کہ کس طبقے میں میرے ہاں تشریف لائیں گے؟“

”کیا تم میرا علیحدہ بھی بدلنا چاہتی ہو؟“

”جی ہاں‘ آپ شلوار قمیض پہن کر جلسوں میں جاتے ہیں۔ تقریریں کرتے ہیں۔ یہ قومی لباس ہے۔ عوام کے سامنے اسی لباس میں رہنا چاہئے لیکن میں تو خاص لوگوں کی باتیں کر رہی ہوں آپ خاص طور پر سوٹ اور ٹیلی پہن کر آئیں گے۔“

تیسرے دن کے اخبارات میں دو طرح کی خبریں شائع ہوئیں ایک تو وہ تصویریں جن کے ساتھ یہ لکھا ہوا تھا۔ ”اے“ جی خسرو اور ایک اخباری دو شیزہ کا رومانس۔ سنا چوری چھپے تقریر گاہوں اور رستوران وغیرہ میں ملاقات کرتے ہیں۔“

دوسری خبر ان کی شادی کا اعلان تھی۔ ”مغربی اے“ جی خسرو اور شینہ وراثی ازدواج میں شملک ہونے والے ہیں۔ چھبیس جنوری رات کو شاہیماہ رستوران میں راسم ادا کی گئی۔ شادی کی تاریخ کا اعلان جلد ہی کیا جائے گا۔“

جن خانوں نے حد ماگنی قیمت پر وہ تصویریں حاصل کی تھیں‘ انہیں اپنی فکرت کا طرح احساس ہوا۔ وہ یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلیاں دیتے تھے۔ ”چلو‘ کوئی بات اے جی خسرو شادی کا اعلان کر کے بچس گیا ہے۔ اسے شادی کرنی ہی پڑے گی۔“

شادی یوں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ امیر لوگ تو ہنسنے پوچھنے کر لیتے ہیں۔ غریب بھی بسورتے یہ خوشیاں پوری کر لیتے ہیں۔ محبت و درمیانے طبقے کے نوکروں کی ہے جو بھر ہوتے ہیں نہ زیادہ غریب‘ بلکہ غریب ہو کر امیری کا لباس پہنے سوسائٹی میں فٹ چلتے ہیں۔ خسرو کے لئے یہی بات پریشانی کا سبب تھی۔ شینہ اسے چادر سے زیادہ ہیلانا سکھا رہی تھی۔ کتنی تھی۔ ”ہمیں جینے کا حق ہے اور ہمیں جینے کے ذمہ گناہنا چاہئے۔ بوڑھے لباس اگر چٹائی پر سوتے ہیں تو یہ سادہ زندگی نہیں ہے بلکہ ان ماپے پر ظلم ہے۔ ان کے کمزور جسم زمین کی سختی کو برداشت کرتے ہیں۔ گرمی کے ہی زمین گرم ہوتی ہے سردی کے موسم میں انتہائی سرد ہوتی ہے اور بوڑھے کا مذاپ سہتے رہتے ہیں۔“

ایک ہفتے بعد ہی جب شینہ کو اپنی ماہانہ تنخواہ ملی تو وہ اپنی ہونے والی ساس اور سرورہ دو عدد پینگ خرید کر لے آئی۔ خسرو نے دیکھا تو حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ کیا کر رہی

”میں ایسے لباس نہیں پہنتا ہوں۔“

”میں نے آپ کی پچھلی تصویریں دیکھی ہیں۔ آپ سلیقہ بنیم کے ساتھ سوٹ اور کٹائی میں نظر آ رہے ہیں۔ کتنے تو میں وہ تصویر نکال کر دے دوں۔“

”وہ تو برسوں پرانی بات ہے۔ اب میرے طور طریقے بدل گئے ہیں۔“

”آپ صاف کیوں نہیں کہتے کہ سلیقہ بنیم اس قابل نہیں کہ آپ ان کے ساتھ اپنا فوٹو من کر رہے تھے۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو۔ آخر شروع کر دیں عورتوں والی باتیں۔ بھی یہ شادی مجھے بڑی مسکائی پڑ رہی ہے۔“

ثمینہ کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یہ بات اس کے دل کو لگی تھی۔ وہ ایک دم پیچھا ہٹ کر بولی۔ ”جتنی آپ شادی سے پہلے ہی بچتا رہے ہیں؟“

”یہ بات نہیں ہے۔“

ثمینہ نے منہ پھیر لیا۔ ”اب آپ صفائی پیش کریں گے لیکن دل کی بات تو زبان پر آئی گئی ہے۔ دراصل یہ میری خوش فہمی تھی۔ میں نے وقت سے پہلے ہی آپ کو اپنا سمجھ لیا۔ وقت سے پہلے ہی اس گھڑی کرنا دھڑا بن گئی۔ اچھا ہوا کہ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو۔ بات اصل میں یہ ہے کہ تم میرے گھر کے لئے ہی کر رہی ہو“ گھر میں خود کو کٹر محسوس کر رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں نے آج تک اپنے گھر اور گھر والوں کے لئے کچھ نہیں کیا اور تم نے ہل بھر میں بہت کچھ کر دیا ہے۔ تم میری زندگی میں آنے سے پہلے ہی برتری حاصل کر رہی ہو۔“

”بڑے افسوس کی بات ہے۔ عورت گھڑی ذمہ داریوں کو نہ سمجھے۔ ایک بیوی اور بہو کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا نہ کرے تو پھوڑ کھلاتی ہے“ اور وہی عورت تعلیم یافتہ ہو، اپنے فرائض کو سمجھتی ہو، تمام گھڑی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی پورا کرتی ہو۔ اپنے شوہر کے غلط طرز عمل کی غلطی کرتی ہو تو شوہر صاحب احساس کتبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آپ بتائیں، آخر عورت کرے تو کیا کرے؟“

خسرو کے والد نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ ”بیٹے! مجھے تمہارے معاملات میں

داخل تو نہیں دینا چاہئے مگر میں مجبور ہو کر بولنے آیا ہوں۔ تم لوگ جو چاہو کرنا مگر میری بہو کو ناراض نہ کرو ورنہ ہم سب تم سے ناراض ہو جائیں گے۔“

ثمینہ نے کہا۔ ”انکل آپ کے صاحبزادے سمجھتے ہیں کہ میں سینہ ستار بھائی اور سینہ غدار بھائی کی طرح ان پر کچھ خرچ کر کے ان سے بہت زیادہ منافع حاصل کرنا چاہتی ہوں۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو۔“

”صحیح تو صرف آپ سمجھتے ہیں۔ اگر اتنے ہی سمجھ دار ہوتے تو اس پہلو پر غور کرتے کہ میں جو کر رہی ہوں تو کس کے لئے کر رہی ہوں۔ آپ کے لئے، آپ کے والدین کے لئے، آپ کے بھائیوں کے لئے اور بہنوں کے لئے، اور خود اپنے لئے کیونکہ یہ گھر میرا ہے لیکن آپ میری محبت کو، میرے غلوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ شاید آپ کے دماغ کے کسی گوشے میں یہ بات ہو کہ میں اپنے بچکے سے دنیا بھر کا چیز لے کر آؤں گی اور آپ کو زیر بار کر دوں گی۔ اگر ایسا سوچتے ہیں اور میرے غلوں پر شبہ کرتے ہیں تو شیخے کا علاج نہ عظیم لقمان کے پاس تھا نہ میرے پاس ہے۔“

اس نے شکایت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر وہاں سے جانے لگی، خسرو نے کہا۔ ”ثمینہ رک جاؤ۔“

وہ دروازے پر رک گئی۔ پلٹ کر بولی۔ ”آپ مسکائی چیزیں خریدنے کو طیر ضروری سمجھتے ہیں اور آپ نے ابھی اپنی ذہن سے کہہ دیا ہے کہ یہ شادی مسکائی پور رہی ہے۔ آج یہ چلا کہ کچھ لوگ شادی کرتے وقت ایک بیٹے کی طرح اور زانی اور گرانی کا حساب کرتے ہیں۔ آپ حساب کرتے رہیں۔“

یہ کہتے ہی وہ ایک جھٹکے سے پلٹ کر تیزی سے چلتے ہوئے باہر جاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ خسرو نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے پر پہنچ کر اسے آواز دی، لیکن وہ پلٹ کر نہیں آئی۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ کیا کرے؟ وہیں کھڑا رہ جائے کہ اس کے پیچھے جائے؟ آج تک وہ کسی عورت کے پیچھے نہیں گیا تھا، اس لئے آگے بڑھتے ہوئے ہچکچاہٹ سی ہو رہی تھی۔

اس نے پلٹ کر کمرے میں اپنے والد کو دیکھا۔ بوڑھے باپ نے آگے بڑھتے ہوئے

پوچھلہ "کچھ سمجھ میں آیا؟ نہیں سمجھو گے۔ عورت جب اپنا گھر بنا رہی ہے تو یہی کہتی ہے جو ہماری ہونے والی ہو کر رہی ہے۔ اگر اس گھر میں پہلے سے کچھ موجود ہوتا تو وہ کچھ نہ کرتی۔ اطمینان سے دلن بن کر چلی آئی۔ تم نے اسے بے اطمینان کیا ہے۔ اس کے اندر ایک عورت کو بھڑکایا ہے کہ پہلے وہ اپنا گھر بنائے پھر دلن بن کر آئے۔"

وہ بے یقینی سے ادھر ادھر ٹھٹھکے لگے۔ پھر اس نے کہہ "میں کیا کروں؟ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"سمجھنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ گھر بنا رہی ہے 'بگاڑ نہیں رہی ہے۔' اتنے میں خسرو کی امی تیزی سے چلتے ہوئے کمرے میں آئیں۔ انہوں نے بیٹے کو دیکھلہ پھر پریشان ہو کر پوچھلہ "کیا بات ہے؟ ہو رہی کیوں رہی تھی؟ میں نے کہا 'ہی؟' واپس آجاؤ لیکن وہ ضحیٰ آئی۔ رکشہ میں بیٹھ کر آنسو پونچھتے ہوئے چلی گئی۔"

خسرو ایک دم سے تڑپ گیا۔ اس کے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کوئی اس کے لئے رو رہی تھی۔ ہائے! سوچو تو رونے والی پر کتنا پیار آتا ہے۔

تب اس رونے والی کے خیالی آنسوؤں نے اسے سمجھنا شروع کیا۔ وہ جو کچھ کر رہی ہے محبت سے کر رہی ہے 'خلوص سے کر رہی ہے' اپنا سمجھ کر کر رہی ہے اور وہ ہے کہ ہر بات پر اعتراض کئے جا رہا ہے 'صرف اس لئے کہ اس کے اصولوں کو پس پشت ڈھلا جا رہا ہے۔ محبت سے سوچو تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ اس کے دماغ نے سمجھایا کہ دنیا میں کتنے ہی دانشوروں نے 'کتنے ہی فلسفیوں نے طرح طرح کے اصول بنائے۔ ہر دانشور اور فلسفی اپنے اصولوں کو مستند اور جامع سمجھتا رہا۔ کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ اس نے جو اصول بنائے ہیں وہ حقیقت کے لئے اور دوسروں کے لئے مستند اور جامع ہوں۔ ان میں تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں اور ٹھینے تبدیلیاں لا رہی تھی۔

بے شک عورت مرد کے لئے بڑی اہم ہوتی ہے لیکن بعض مردوں کی نظروں میں عورت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ کم از کم خسرو نے نو برس تک عورت کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ عورت کی محرومی نے اسے دوسری چیزوں سے محروم رہنا سکھا دیا۔ واقعی کتنی ہی ضروریات کے بغیر وہ اب تک گزارہ کرنا چلا آ رہا تھا۔ اب یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ انسان شہری آبادی سے اور شہری ضروریات سے دور جنگل میں بھی زندہ رہ سکتا

کمرے سے باہر آیا۔ چھوٹے سے آئینہ میں پہنچ کر دیکھلہ سامنے ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دروازے سے ذرا فاصلے پر وہ کمرے کے اندر ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بڑی محبت کے عالم میں تھی۔ کچھ سوچ رہی تھی اور سوچنے کے دوران بے خیالی میں انگوٹھے کو ہونٹوں میں دبائے پتھر پیچم کی یاد تازہ کر رہی تھی۔

وہ چپ چاپ دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے بڑی دلچسپی سے 'بڑی محبت سے دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے کلیاں انگڑائی لے کر پھول بننے لگیں۔ کنول کا حسن کچھڑ سے خوشبو نچوڑ رہا تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اپنی آمد کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔ بس اسی طرح اسے بچپن اور جوانی کے عظم پر دیکھتے رہنا چاہتا تھا۔

پھر وہ خود ہی جانے کیسے چوٹک گئی۔ اس نے ذرا سر گھما کر دیکھا تو وہ سامنے کھڑا ہوا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی جلدی سے سر پر آئینہ رکھ کر منہ پھیرنے لگی۔ خسرو نے آگے بڑھ کر کہہ "تم ناراض ہو کر چلی آئیں۔ میں تمہیں منانے آیا اب تو خسر ختم ہو جانا چاہئے۔"

"مجھے خسر دیکھنا نہیں آتا۔"

"پھر یہ کیا ہے؟"

"میں نے کچھ عرصہ کے لئے فاصلہ قائم کیا ہے۔"

"فاصلہ کب تک قائم رہے گا؟"

"جب تک آپ اپنی ضروریات کی تمام منگلی چیزوں کی ایک فہرست نہ بنالیں۔ میں اس فہرست میں دیکھوں گی کہ میرا کام ہے یا نہیں؟ اس کے مطابق فاصلہ کم ہو گا یا پھر اتنا بڑھ جائے گا کہ ہم ایک دوسرے کو نظر نہیں آئیں گے۔"

"ہاں، ہم نظر نہیں آئیں گے۔ ہم اتنے قریب ہوں گے ایک دوسرے کے اتنے قریب ہوں گے کہ ہماری نظریں بھی ہمیں نہیں دیکھ سکیں گی۔"

"آپ لچھے دار باتیں کر رہے ہیں۔ میں حقیقت سننا چاہتی ہوں۔"

"تم میری زندگی کی بہت اہم ضرورت ہو اور اہم ضرورت کے لئے ارزانی اور گرانی میں دیکھتی جاؤ۔"

"یہ آپ کا جذباتی فیصلہ بھی ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو بہت اچھا مشورہ دیتی ہوں۔"

ہے لیکن اس جگہ میں ایک عورت مجھ مجھ کرتی آجائے تو تمام مخالفانہ شرے اصول اس کے پیچھے ہاتھ ہاتھ سے چل پڑتے ہیں۔

وہ گھر سے نکل گیا۔ پیدل ہی ایک طرف پلٹے لگا۔ کوچہ جاہلی کی طرف جاتے ہوئے سوچے لگا کہ ادھر نہیں جانا چاہئے۔ اپنے جذبات کو کچل دینا چاہئے۔ راستے کو بدل دینا چاہئے۔

وہ راستہ بدل کر جانے لگا۔ بس یونہی کوئی مقصد نہیں تھا۔ کوئی منزل نہیں تھی۔ سامنے جو راستہ دکھائی دیتا تھا اس پر چل پڑتا تھا۔ ایک گلی سے دوسری گلی۔ دوسری گلی سے تیسری گلی۔ پھر یہ انکشاف ہوا کہ اس شہری ہر گلی در جاہلی تک جاتی ہے۔ جب وہ تھک کر رک گیا۔ رکنے کے بعد اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ ٹینے کے دروازے پر پہنچ گیا تھا۔

اس نے کل کل کے ٹین کو دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ہونے والی سانس نے دروازہ کھولا۔ اسے دیکھتے ہی مسکرائیں خوش ہو کر بولیں۔ "آؤ بیٹے آجائو۔"

انہوں نے دروازے کو پوری طرح کھول دیا۔ وہ گھر سے داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "میں دراصل انکل سے لئے آیا ہوں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ "تم تو جانتے ہو وہ اس وقت دفتر میں ہوتے ہیں۔ بہر حال بیٹو تو سہی۔ میں تمہارے لئے چائے لاتی ہوں۔"

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں اسے تلاش کر رہی تھیں جو نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا دل پوچھ رہا تھا۔ وہ واپس آ چکی ہے یا نہیں؟ شاید وہ دفتر چل گئی ہو یا کسی سبلی کے پاس گئی ہو۔

یہ کہہ کر وہ چل گئیں۔ خسرو تھوڑی دیر تک بیٹھا رہا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر اتر

آپ ایک ماہ تک اس مسئلے پر غور کریں۔ اس کے ایک ایک پہلو کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں ابھی آپ کی زندگی میں باقاعدہ داخل نہیں ہوئی لیکن ابھی سے میں نے آپ کے اصولوں کو بدلنا شروع کر دیا ہے۔ میں اس بات کو مانتی ہوں۔ اگر آپ کے اصولوں پر ساری قوم عمل کرے تو منگائی ایک ہی دن میں ختم ہو جائے لیکن ساری قوم کے لئے یہ مسم چلائی نہیں جاسکتی۔ منگائی کو اس طرح ختم کرنا بہت ہی دشوار ہے۔ اس دشواری کو آپ میرے تعلق سے سمجھ سکتے ہیں۔ میں خواہ آپ کے لئے کتنی ہی مٹلی پڑوں خواہ آپ کو اپنے اصولوں سے منحرف ہونا پڑے تب بھی آپ میری تمنا کرتے رہیں گے اور آپ بھی کر رہے ہیں۔ اسی طرح مختلف لوگوں کی مختلف ضروریات ہیں۔ ہر شخص کی نظر میں اس کی اپنی ضرورت اہم ہوتی ہے۔ کوئی روٹی کو اہمیت دیتا ہے کوئی عورت کو اور کوئی گوشت کو۔ بہت سے لوگ در وقت لگاتے کر کے اور ان روٹیوں کے پیچھے بچا کر اچھا لباس پہنا پند کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو نہ تو اچھا کھانا پند کرتے ہیں نہ اچھا پہنا پند کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی نظروں میں اپنے گھر کا ڈرائنگ روم سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اس ڈرائنگ روم کو اچھے فرنیچر، ٹی وی، کیمٹ ریکارڈر اور دوسرے نمائشی سامان سے سجانے کے لئے وہ ہر طرح کی تکالیف برداشت کر لیتے ہیں۔ اپنا من مارتے ہیں۔ اپنے خمیر کو بھی مارتے ہیں۔ طرح طرح سے ٹائلاز رقیں حاصل کرتے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح اس نمائش کو جاری رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں سب سے زیادہ اہمیت نمائش کی ہے۔ ہم سب کچھ ختم کر سکتے ہیں۔ شاید آپ کی مسم کا پیاب ہو جائے تو ایک ماہ تک گوشت کھانا بھی چھوڑ سکتے ہیں لیکن نمائش نہیں چھوڑ سکتے۔"

"تم پوری قوم کی باتیں کر رہی ہو اور میں اپنی اور تمہاری بات کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تناؤ ہم دونوں اپنی ضروریات میں کس حد تک کی کر سکتے ہیں؟"

"آپ ایک لیڈر ہیں۔ رہنا ہیں۔ آپ قوم سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اس وقت میں پوری قوم میں سے ایک فرد ہوں۔ اگر آپ مجھے ضروریات کم کرنے کے سلسلے میں کہہ رہے ہیں تو گویا پوری قوم کو کہہ رہے ہیں۔ اگر سب ہی ایسا کر سکتے ہیں تو میں بھی ضرور کروں گی اور سب ایسا نہیں کر سکتے تو پھر مجھ اکیلے سے یہ سوال نہ کریں۔"

"میں تم سے سوال کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ ہم دونوں ایک ازدواجی گھریلو زندگی

گزارنے والے ہیں۔ ہمارے رشتے ہماری محبتیں دوسروں سے مختلف ہیں۔“
 وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”پہلے آپ گھریلو معاملات میں ہی باتیں کریں۔
 آپ میری ایک بات کا جواب دیں۔ آپ کے گھر والے آپ کو کس قدر چاہتے ہیں؟“
 ”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ وہ میری ہر خواہش کو اپنی خوشی سمجھتے ہیں۔ جو کتا
 ہوں اس پر عمل کرتے ہیں۔“

”یہ میں نے بھی دیکھا ہے۔ وہ معمولی لباس پہنتے ہیں، آپ جو کھلاتے ہیں، کھالیتے
 ہیں۔ یعنی یکطرفہ محبت ہے۔ سب آپ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ کسی سے محبت نہیں
 کرتے۔“
 ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اگر آپ اپنی بہنوں سے محبت کرتے تو یہ سوچتے کہ لڑکیوں
 شادی بیاہ کی تقریب میں جا کر دوسروں کے سامنے کس طرح احساس کتری میں مبتلا ہوتی
 ہوں گی۔ میک اپ سے جگمگاتے ہوئے روشن چہروں کے سامنے ہنسی ہنسی لگتی ہوں گی۔
 اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی ہوں گی اور سرد آہ بھر کر رہ جاتی ہوں گی۔“
 خسرو نے کہا۔ ”حسن میں مبالغہ نہ ہو، سادگی ہو تو وہ ہزار میک اپ سے ہماری ہوتا
 ہے۔“

”یہ آپ اپنے نظریے سے کہہ رہے ہیں۔ یا ان کی نمائندگی کر رہے ہیں جو عورت
 کو گھر کی چار دیواری میں قید کر کے رکھتے ہیں کسی دوسرے کی نظر اس پر پڑنے نہیں
 دیتے۔ کوئی دیکھ بھی لے تو وہ ہر طرح کی مبالغہ سے خالی ہو۔ ہنسی ہنسی دیران دیران
 سی لگتی ہو۔ یہ عورت کے خلاف سازش ہے ورنہ آج کی دنیا میں نہ تو بلیک اینڈ وائٹ
 فلمیں بنتی ہیں اور نہ ہی لوگ بلیک اینڈ وائٹ کی وی زیادہ پسند کرتے ہیں۔ سب ہی مگر
 فلموں اور فلمی وی کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ رنگینی سب کو پسند ہے۔ پچھلے زمانے میں لوگ
 رنگوں کو سمجھتے ضرور تھے لیکن رنگوں کو قابو میں کرنا نہیں جانتے تھے۔ آج ہم نے اسے
 قابو میں کیا ہے ان رنگوں کو اپنے چہروں پر اتارا ہے۔ ہم نے قدرت کی دی ہوئی نعمتوں
 کی قدر کی ہے، کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ جس طرح آپ یہ کہتے ہیں کہ مسکی چیزیں خریدنا
 چھوڑ دیا جائے تو منگانی ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح آپ اس قوم کے تمام مردوں سے کہتے

کہ وہ اپنی عورتوں کو میک اپ نہ کرنے دیں بلکہ میک اپ کا سامان ہمارے ملک میں کبھی
 نہ آئے لیکن ایسا نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے، مردوں کی اکثریت عورتوں
 کو کلر فل دیکھنا چاہتی ہے۔“

خسرو نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ ”میں تم سے جب بھی کوئی بات کرتا ہوں تو
 وہ بحث کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یعنی ہمیں کسی نتیجے پر پہنچنا چاہیے۔“
 ”محبت کا نتیجہ شادی ہے۔ ہم شادی تک پہنچ رہے ہیں۔ اب شادی کا جو نتیجہ ہوتا
 ہے اس پر آپ غور کریں۔ میں تو غور کر چکی ہوں۔ اپنا فیصلہ سنا چکی ہوں۔“
 اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ ہمارا چلنے کے لئے آیا ہوں۔ تم
 اپنی پسند سے میرے لئے سوٹ کا کپڑا ٹائی اور جوئے وغیرہ خریدو۔ اب تو خوش ہو؟“
 وہ خوش ہو گئی۔

☆-----☆-----☆

اے جی خسرو دو طرفہ مصروفیات میں الجھا ہوا تھا۔ ایک طرف شادی کی دلچسپ
 تیاریاں تھیں۔ دوسری طرف لیڈری کی الجھنیں تھیں۔ کچھ اس طرح زندگی گزر رہی تھی
 کہ ایک طرف وہ تقریریں کر رہا تھا، بیانات دیتا تھا کہ وہ برسر اقتدار آئے گا تو روٹی، کپڑے
 اور مکان سے قطعاً رکھنے والی ہر چیز سستی کر دے گا حتیٰ کہ ہر غریب آدمی کو رہنے کے
 لئے ایک مکان میسر ہو گا۔ دوسری طرف وہ اقتدار حاصل کرنے سے پہلے ہی اپنے پورے
 گھر والوں کے ساتھ سوسائٹی کی شاندار کونٹری میں منتقل ہو گیا تھا۔ ٹینڈ کے رشہ دار
 اسلام آباد سے آئے تھے امریکہ سے آئے تھے اور خسرو جیسا بڑا لیڈر ان سے کمتر نہیں
 ہو سکتا تھا۔ ٹینڈ کے احساس برتری کا خیال رکھتے ہوئے اعلیٰ سوسائٹی میں سوٹ ٹائی پہنتا
 تھا، جلسے، جلوس میں شلوار قمیض پہن کر شریک ہوتا تھا۔ اپنے اور ٹینڈ کے رشتہ داروں
 کے ساتھ ہلکے مٹانے جاگ۔ کسی تقریب میں شریک ہوتا تو ہیٹ، پی کیپ، مسکی کیپ،
 گولف کیپ پہنتا تھا۔ اخبارات کے لئے تصویریں اٹارتے وقت جناح کیپ پہن لیا کرتا
 تھا۔

وہ کبھی ٹینڈ سے پوچھتا تھا۔ ”یہ میں کیا کر رہا ہوں؟“
 ”کسی کر رہے ہیں جو حالات کا تقاضا ہے۔ آپ صرف مزدوروں کے رانا ہوتے تو

گوشت خریدیں گے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”یہ تو آنے والا وقت ہی بنا سکتا ہے ویسے میں عوام سے ہاتھ جوڑ کر التجائیں کر رہا ہوں کہ وہ پوری دیانتداری سے منگائی کے خلاف جہاد کریں۔ گوشت کے خلاف جو تحریک چلنے والی ہے یہ ایک نمونہ ہے۔ اگر اس میں کامیابی ہوئی تو آئندہ دوسری متعلق چیزوں کے خلاف تحریکیں چلیں گی۔ اس طرح رفتہ رفتہ ہمیں امید ہے کہ منگائی لیکٹاکم ہوتی جائے گی۔ اگر تحریک پچاس فیصد تک کامیاب رہی تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ کم از کم منگائی بڑھانے کے کاروبار ختم ہو جائے گا۔“

منگائی ٹھکانے کرنے کا منصوبہ بھٹا تھا جس کے خلاف کوئی بھی صاحب عقل اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ اخبار والے اس منصوبے کی حمایت کر رہے تھے۔ عقل میں یہ بات آئی تھی کہ جو چیز منگائی ہوتی جائے اسے سب لوگ استعمال کرنا ترک کر دیں تو دکاندار اسے بازار میں پھیلانے کے لئے عوام میں اس کی طلب بڑھانے کے لئے اس کی قیمت گراتے جائیں گے۔ یہ کاروبار کا اصول ہے۔

بے شک خسرو نے ایک نئے انداز کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ یہ تحریک آئندہ تاریخی اہمیت اختیار کرنے والی تھی لیکن اس کے اندر شادی کی تحریک بہت زیادہ اہمیت اختیار کر رہی تھی۔ یوں تو اس نے نو برس تک کسی عورت کو اپنے دل میں جگہ نہیں دی اور نو برس تک کسی عورت سے دور رہ سکتا تھا لیکن اب نو منٹ کے لئے بھی شینہ سے دور رہنا مہوار انہیں تھا لہذا تو میری تحریک تاریخ کو شادی ہو گئی۔

یہ شادی اگرچہ بڑی آن بان اور شہن سے ہوئی تھی۔ اعلیٰ طبقے کی خوشیوں کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ بہت ہی پُر تکلف دعوت کی گئی تھی لیکن اس دعوت سے اخبار والوں کو اور سیاسی لوگوں کو بے خبر رکھا گیا تھا۔ دوسرے دن دسمبر کی پہلی تاریخ کو اخبار کو یہ خبر پہنچائی گئی کہ اے جی خسرو نے مس شینہ درانی کے ساتھ نہایت سادگی سے نکاح پڑھایا ہے۔

پہلی تاریخ کے اخبارات میں کچھ اور بھی تھا۔ شر کے تمام قصائیوں نے اخبارات کے پورے صفحے پر ’آدمے صفحے پر‘ پورے کالم پر ’آدمے کالم پر طرح طرح کے اشتہارات شائع کرائے تھے مثلاً ایک سیر گوشت خریدنے والوں کو ایک کوہن دیا جائے گا پندرہ دسمبر

چٹائی پر بیٹھ کر سادہ زندگی گزار کر کامیاب لیڈر بن سکتے تھے، لیکن آپ پوری قوم کے لیڈر ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ ہر طبقے کو خوش رکھیں۔ ہر طبقے میں ان کے طرز رہائش کے مطابق کھل مل کر رہیں۔ سبھی کامیاب ہو سکتے ہیں۔“

پھر وہ کامیاب ہونے کے لئے دن رات کوششیں کر رہا تھا۔ اپنے لوگوں کے ساتھ شر کے گلی کوچوں میں جاتا تھا۔ تقریریں کرتا تھا۔ وہاں کے نمائندہ لوگوں کو سمجھاتا تھا۔ مخالف پارٹیوں کے لیڈروں سے اپیل کرتا تھا کہ منگائی ٹھکانے کی مسم کو کامیاب بنانے کے لئے ان سے تعاون کریں۔ اس میں عوام کی بھلائی ہے۔

اس سلسلے میں جگہ جگہ پوچھے جانے لگے جارہے تھے۔ دیواروں پر لکھایا جا رہا تھا۔ ”منگائی ٹھکانے دسمبر کی پہلی تاریخ سے اکتیس تاریخ تک گوشت نہ خریدیں۔ گوشت نہ پکائیں گوشت نہ کھائیں۔“

ایک اخباری رپورٹر نے سوال کیا۔ ”جناب خسرو صاحب! آپ نے گوشت پر پابندی عائد کی ہے لیکن اہلے لوگ مچھلیاں کھا کر گوشت کی کمی کو پورا کر لیں گے۔ پھر یہ پابندی تو نہ ہوگی؟“

”میں تو چاہتا ہوں کہ لوگ اس دوران مچھلیاں کھائیں اور گوشت کو بھول جائیں۔ میری تحریک گوشت کی بڑھتی ہوئی قیمت کے خلاف ہے۔ میں گوشت کی مناسب قیمت طے کرانا چاہتا ہوں چڑاگاہوں اور مویشیوں سے لے کر گوشت کی دکانوں تک قصائیوں اور مویشی فروشوں کے جو مسائل ہیں انہیں جس قدر اخراجات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور حکومت کو جو ٹیکس ادا کرنے پڑتے ہیں تو ان کی شکایات یا غلطی وہ حکومت سے نہیں کراتے بلکہ سیدھے عوام کی جیبوں پر بوجھ ڈالتے ہیں۔ میں ان کے خلاف جہاد کر رہا ہوں۔“

ایک اور اخبار کے نمائندے نے سوال کیا۔ ”جناب خسرو صاحب! ہم پوری قوم کو مسلمان بنا سکتے ہیں لیکن مومن نہیں بنا سکتے۔ مومن بننے کے لئے جذبے کی سچائی اور عمل کا حوصلہ چاہئے۔ اسی طرح آپ قوم کو گوشت کی منگائی کے خلاف احتجاج کرنے پر آمادہ کر سکتے ہیں لیکن پوری قوم کو گوشت کھانے سے نہیں روک سکتے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی تحریک کے دوران لوگ خفیہ طور پر اپنے گھروں میں گوشت کھائیں گے اور

سالن کا اہتمام کیا گیا تھا۔

اے 'جی خسرو اور مخالفین کے درمیان بڑا سخت مقابلہ تھا۔ ۵ تاریخ کے اخبارات میں ان خبروں نے دھوم مچادی کہ اے 'جی خسرو نے گوشت کے بغیر ویسے کی دعوت کی اور وہ دعوت نہایت شاندار رہی۔ لوگوں نے پہلی پلاؤ کو گوشت سے زیادہ پسند کیا۔ دوسری طرف انہی اخبارات میں چند تصاویر شائع کی گئیں۔ ان تصویروں میں چھوٹی ممر کے بچے دکائوں سے گوشت خریدتے نظر آ رہے تھے۔ یقیناً وہ اسکر اور کھلونوں کے لالچ میں گوشت خرید رہے تھے۔ دوسری بات سمجھنے کی یہ تھی کہ بچے گوشت خریدنا کیا جائیں۔ بچوں نے انہیں دکائوں پر بھجوا تھا تاکہ رضا کاروں پر اعتراض نہ کر سکیں۔

۶ تاریخ سے مخالف پارٹی کے لیڈروں نے بیانات دیتے شروع کئے۔ بیانات مکہ یوں تھے کہ منگالی شادی کی تحریک اچھی ہے لیکن بے وقت ہے۔ اتر عید کے بعد شادی بیاہ کی تقریبات کے لئے مسلمانوں کو صرف میں دن ملتے ہیں۔ اس کے بعد محرم کا مہینہ شروع ہو جاتا ہے اور شادی کی تقریبات ایک طویل عرصے کے لئے رک جاتی ہیں۔ یہ تحریک محرم کے بعد چلائی جاتی تو بہتر ہوتا۔ اکثر لوگ گوشت کی پابندی پر عمل نہیں کریں گے۔ خود سیاسی پارٹی کے لیڈروں اور کارکنوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔ شادی بیاہ کے موقع پر گوشت پلاؤ وغیرہ کی خوب دعوتیں گئیں۔ اخبارات میں ان دعوتوں کی تصاویر شائع کرائیں کیونکہ انہیں کسی کا ڈر نہیں تھا۔ انہوں نے کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا تھا۔ صدیوں کے رسم و رواج کے مطابق دعوتیں کی تھیں۔

سارے شہر میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک محلے میں ایک پڑوسن نے دوسری پڑوسن سے کہا۔ ”بھن خدا کا شکر ہے۔ ادھر ایک ہفتے سے انہوں نے گوشت نہیں کھایا ہے تو دماغ میں گرمی بھی نہیں ہے۔ اب خسر نہیں دکھائے ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔“

دوسری پڑوسن نے جل کر کہا۔ ”اے 'ایسا بھی کیا ہے کہ میاں ٹھنڈے ہی پڑ جائیں۔“

شراب خانوں میں گاہکوں کے سامنے ویٹر شراب پیش کرتے وقت یہ بات کانوں میں پھونک دیتے تھے۔ ”اب کھلم کھلا گوشت کے کباب نہیں مل سکتے۔ ہم نے خفیہ طور پر

اور اکتیس دسمبر کو ان کوپن کے نمبروں کی قرعہ اندازی ہوئی۔ اس قرعہ اندازی کے نتیجے میں پہلا انعام ایک کار، دوسرا انعام ایک موٹر سائیکل، تیسرا انعام ایک ٹی وی، چوتھا انعام کیسٹ ریکارڈر اور ریڈیو، اسی طرح کے مختلف انعامات کا لالچ دیا گیا تھا۔

ہات صرف لالچ کی نہیں تھی گوشت کھانے کی بھی تھی۔ اب لوگوں کے سوچنے کا انداز یہ تھا کہ ایک تو گوشت بھی کھانے کو ملے گا دوسرے انعامات کی توقع رہے گی۔ کاروباری حضرات خوب جانتے ہیں کہ بچوں کو زیادہ سے زیادہ لالچ دیا جائے تو ان کے بڑے منگی سے منگی چیز خریدنے پر مجبور ہو جاتے ہیں لہذا انہوں نے صرف اخبارات میں ہی نہیں 'ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے بھی اشتہارات کی پلاننگ کر دی۔ اشتہارات مکہ یوں تھے کہ ایک سیر گوشت خریدنے پر خوبصورت اسکر دیئے جائیں گے دو سیر پانچ سیر 'دس سیر تک گوشت خریدنے والوں کو خوبصورت کھلونے دیئے جائیں گے۔ یہ بچوں کے لئے ایسی کشش تھی کہ وہ اپنے بڑوں کو پریشان کرنے لگے۔

۲ تاریخ کے اخبارات میں کتنے ہی تصانیف کی دکانوں کی تصویریں شائع کی گئیں جہاں گوشت ہی گوشت نظر آ رہا تھا، گاہک نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابھی اشتہارات کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے رضا کار دکائوں سے دور گھوم رہے تھے اور لوگوں کو سمجھا رہے تھے کہ گوشت نہ خریدیں۔ ان کے علاوہ حکومت کی طرف سے پولیس والوں کی بھی ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ کوئی دیکھا فیلو نہ ہو سکے۔ حکومت کی طرف سے عوام کو یہ سمجھایا گیا تھا کہ وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ رضا کاروں کو سمجھایا گیا تھا کہ وہ صرف سمجھا سکتے ہیں 'انہیں جبراً خریداری سے روک نہیں سکتے۔ تصانیف کو بھی سمجھایا گیا تھا کہ وہ رضا کاروں سے جھڑانہ کریں۔ ہر حال وہ پہلا دن امن و امان سے گزر گیا۔

دوسری تاریخ کو اے 'جی خسرو اور فینز کی شادی کی خبر جلی حوں میں شائع کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی اعلان کیا گیا کہ ۴ دسمبر کو دعوت دلیہ ہے۔ ہر خاص و عام سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس دعوت میں شریک ہو کر اے 'جی خسرو اور بیگم خسرو کو شہر کے کاموقع دیں اور یہ بھی مشاہدہ کریں کہ نکاح اور دلیہ جیسی اہم تقریبات میں بھی کتنی سادگی سے دعوت دی جاسکتی ہے۔ اس دعوت میں صرف پہلی پلاؤ اور محل کے

انتظامات کئے ہیں جو ایک پوا خریدے گا اسے ایک سچ کباب ملے گا۔ ایک اور سے پر تین سچ کباب مل سکتے ہیں اور ایک بوتل پر پانچ سچ کباب خریدے جاسکتے ہیں۔ فی سچ دو روپے کے صلب ہے۔

ہوٹلوں میں گاہکوں سے کہہ دیا جاتا تھا۔ ”میں بیٹھ کر کھانا ہوتا تو طرح طرح کی ہیزوں کے سالن مل سکتے ہیں۔ گھر لے جانا ہوتا کسی بھی گوشت کا سالن پارسل کیا جاسکتا ہے۔“

ایک اخبار میں ایک کارٹون شائع کیا گیا۔ اس کارٹون میں دکھایا گیا تھا کہ ایک دیہے کے دیوانہ کی شادی ایک بہت ہی موٹی بھگلی دلس سے ہو رہی تھی بیٹے نے کھانا ہوا تھا تیریاں صاف خور دی تھیں تو لے سے چڑھایا جا رہا ہے قبول ہے؟“

ایک کارٹون میں دکھایا گیا تھا کہ میاں بیوی کا بھگڑا دوروں پر ہے۔ بھگڑے کے دوران بیوی نے اپنے میاں کے بازو کو دانتوں سے روچ لیا تھا۔ ”مجھے کھانا ہوا تھا۔“ پکا۔ ”سہی کچا ہی سہی۔“

اے جی خسرو مخالفوں کا سامنا کر رہا تھا جگہ جگہ تقریریں کرتا تھا لوگوں کو سمجھاتا تھا۔ اخبارات میں بیان شائع کرتا تھا اپنے طور پر ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ ادھر شینہ نے سرکاری عہدہ اردوں کی بیگمات سے رابطہ قائم کر لیا تھا۔ ان کے ہاں تقریبات میں شریک ہونے لگی تھی۔ دونوں میاں بیوی تمام دن اپنی اپنی جگہ مصروف رہتے تھے۔ رات کو ایک جگہ ہوتے تو اپنی من مہر کی مصروفیات کا ذکر کرتے۔ خسرو نے پوچھا۔ ”یہ تمہیں کیا سوچھی ہے تم سرکاری افسران سے کیوں ملتی ہو؟ کیوں ان کے ہاں جاتی ہو؟“

”میں نئی راہیں کھول رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے جس راہ پر آپ چل رہے ہیں اس میں ناکامی ہو پھر ہمارا کیا ہو گا؟“

”شینہ! تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ پتہ نہیں کیا سوچتی ہو اور کیا کرتی ہو اور جو کچھ بھی کرتی رہتی ہو وہ میرے اصولوں کے خلاف ہوتا ہے۔“

شینہ نے اس کی گردن میں بائیس ڈال کر بڑے پیار سے کہلا۔ ”اب آپ کے اصول کہاں رہے؟ بس ایک چیز رہ گئی ہے اور وہ میں ہوں۔“

دو ہفتے بعد یہ انکشاف ہوا کہ تھائیوں کی دکانوں پر گاہک نہیں آتے ہیں پھر بھی

شام سے پہلے سارا گوشت فروخت ہو جاتا ہے۔ منگالی خانا کی تحریک چلانے والے ان چور دروازوں کو بند نہیں کر سکتے تھے۔ جہاں سے گوشت فروخت ہوتا تھا اگر انہیں بند کرنا چاہتے تو دنگے خساد کا اندیشہ تھا اور وہ بڑے ہی پراسن طریقے سے تحریک جاری رکھتا چاہتے تھے۔

۲۵ دسمبر کی رات کو اے جی خسرو نے شینہ سے کہلا۔ ”مجھے شب ہے کہ یہ کوٹھی تمہارے دلہنے مجھے نہیں دی ہے۔ جو کار میں استعمال کر رہا ہوں وہ بھی تمہیں جیز میں نہیں ملی ہے۔ اس کے پیچھے سینہ ستار بھائی اور غفار بھائی کا ہاتھ ہے۔“

”آپ کو شبہ کیوں ہو رہا ہے؟“

”اس دوران میں کئی بار تمہیں سینہ ستار بھائی اور کئی بار سینہ غفار بھائی کے ساتھ دیکھ چکا ہوں۔ آج صبح جو چیک تم نے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرایا ہے وہ میری نظروں سے گزر چکا ہے۔ اب یہ نہ پوچھنا کہ میں نے کس طرح تمہارے اکاؤنٹ کو چیک کیا ہے لیکن وہ چیک سینہ غفار بھائی کا تھا۔“

”آپ اس حد تک جان گئے ہیں تو اور کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

وہ ایک بیک فیس سے ہستہ بیٹھ گیا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ”میں صرف تمہاری زبان سے تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ آج پتہ چلا کہ یہ کوٹھی یہ کار یہ پیش و آرام سب رشوت کی کمانی سے ہے۔ تم نے میرے کیمپز کو بالکل ہی تباہ کر دیا ہے۔“

”آپ مجھے کھٹے کی کوشش کریں۔ نہ تو آپ نے کسی کا احسان لیا ہے نہ ہی کسی سے رشوت لی ہے۔“

”نیکو اس مت کرو۔ آج تک میں نے کسی سے اتنی نفرت نہیں کی جتنی تم سے ہو رہی ہے۔ میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے جانے لگا۔ شینہ نے ہستہ سے اٹھتے ہوئے کہلا۔ ”ایک بات سننے چاہیے۔ جو میں کر رہی ہوں۔ اس کے نتیجے میں بڑے بڑے دولت مند گھرانوں سے آپ کی چاروں بہنوں کے لئے رشتے آرہے ہیں۔“

خسرو نے جاتے جاتے یہ بات سنی لیکن وہاں رک نہ سکا۔ غصے سے شکار ہوا کوٹھی سے باہر آیا۔ باہر آکر اس نے پورچ میں کھڑی ہوئی کار کو دیکھا۔ وہ وہاں سے دور جانا

چاہتا تھا، لیکن وہ کار رشوت میں حاصل کی تھی اسے استعمال نہیں کر سکتا تھا وہ سوچا ہوا احاطے کے مین گیٹ پر آیا۔ چونکہ اس نے اس کے لئے گیٹ کو کھول دیا۔ وہ باہر نکل کر فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چلے لگا۔

اتنی بڑی دنیا میں اس کے لئے بہت سی جگہ تھی، بڑا بورڈ میں اس کا اپنا مکان تھا جہاں اب ٹالا لگا رہتا تھا۔ وہ وہاں جا کر رہ سکتا تھا لیکن اب اس کا معیار زندگی بدل گیا تھا۔ وہ نہ تو پیدل چل سکتا تھا نہ ہی معمولی مکان میں رہ کر بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات کر سکتا تھا۔

پھر اس کے دلخ میں شینہ کی وہ بات کو نہ بھولے گی۔ میں جو کچھ بھی کر رہی ہوں اس کے نتیجے میں بڑے بڑے دولت مند گھرانوں سے آپ کی چاروں بنوں کے لئے رشتے آرہے ہیں۔

وہ حیرانی سے سوچنے لگا۔ ایسی کیا بات ہوگئی کہ ایک بیک چاروں بنوں کے لئے رشتے آنے لگے ہیں۔ بڑی بن کی عمر ۲۶ برس تھی۔ اس سے چھوٹی چوبیس، اس سے چھوٹی باتیس اور سب سے چھوٹی انھارہ برس کی تھی۔ اب تک کوئی رشتے کے لئے ادھر بھٹکا نہیں تھا۔ اب اس کی بنوں میں کون سے میرے موتی جھنگا رہے تھے؟

اس میں شبہ نہیں ہے کہ رشوت لینے والے اکثر اپنی عورتوں سے مجبور ہو کر راشی بن جاتے ہیں۔ انہیں خوش رکھنے کے لئے یا ان کی خدمت پوری کرنے کے لئے وہ ناجائز رئیس حاصل کرتے ہیں لیکن وہ ہمارے کیوں کرتے ہیں؟ کیوں عورتوں کے اشارے پر ناپتے ہیں؟

شینہ جو کچھ کر رہی تھی اس کے گھر کی اس کے خاندان کی بھلائی کے لئے کر رہی تھی۔ چاروں بنوں کو سہاگن بنانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ ایک طرف اس نے اس کا کیریئر بہاد کیا تھا، دوسری طرف اس کا گھر بڑی شان و شوکت سے آباد کر رہی تھی۔

وہ ٹھٹکا ہوا پھر کوٹھی میں دلہن آگیا۔ اپنی خواب گاہ میں پہنچا تو شینہ خوش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ فیسے سے بولا "تم مجھے بدنام کر دو گی۔ تمہیں اتنی عقل نہیں ہے کہ جو چیک تم نے سینہ غفار بھائی کے لئے کر اپنے اکاؤنٹ میں جمع کیا ہے اس کے ذریعے تمہیں راشی ثابت کیا جاسکتا ہے اور تمہارے ذریعے میں بدنام ہو سکتا ہوں۔ دنیا یہی کہے گی کہ تم

میرے اشاروں پر ایسا کر رہی ہو۔"

"آپ باخلاق ناراض ہو رہے ہیں۔ میں اتنی نادان نہیں ہوں یہ جو کار ہمارے پورج میں کھڑی ہے میں نے اسے ستر ہزار میں سینہ غفار بھائی کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ فروخت کے کاغذات میں اس چیک کا نمبر درج ہے۔ پھر رشوت لینے کے سلسلے میں کون ہمیں بدنام کر سکتا ہے؟"

اے، جی خسرو اسے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے فیسے سے پوچھا۔ "تم یہ کیا چکر چلا رہی ہو۔ تم نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت مکار ہوتی ہے اور اپنے عیش و آرام کے لئے اپنے سو کی عزت کو خاک میں ملا دیتی ہے۔"

"جس دن آپ کی عزت خاک میں ملے گی اس دن میں آپ سے پہلے خاک ہو جاؤں گی۔ میں یقین سے کہتی ہوں کہ وہ دن بھی نہیں آئے گا۔"

"بس زیادہ مکالمے نہ بولو۔ یہاں سے چلی جاؤ۔ میں اپنے کمرے میں تمہارا وجود برداشت نہیں کر سکتا گیٹ آؤش۔"

وہ چپ چاپ بستر سے اٹھی اور سر جھکا کر جہانے لگی پھر وہ دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔ اس نے پلٹ کر خسرو کی طرف دیکھا وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پلٹ کر دیکھا تو شینہ سر جھکائے دایرہ کھڑی ہوئی تھی۔ اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو ہونٹوں میں دبائے یوں نظر آ رہی تھی جیسے شرمندگی سے کچھ سوچ رہی ہو۔

خسرو اس کے اس انداز کو دیکھ کر توپ گیا۔ پھر جی کر بولا۔ "تم یہاں سے جاتی ہو یا نہیں؟"

وہ چلی گئی۔ خسرو نے آگے بڑھ کر ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازے کو بند کر دیا۔ اس رات وہ سو نہ سک۔ دوسرے دن اس نے سینہ ستار بھائی سے پوچھا۔ "آپ نے وہ کوٹھی شینہ کو کیسے دی؟"

"اے بھائی! فیسے سے کیوں بولا ہے۔ وہ کوٹھی پانچ لاکھ روپے کا ہے۔ میں نے ایک لاکھ روپے میں اسے شینہ بائی کے ہاتھ بیچ دیا۔"

"لیکن وہ ایک لاکھ روپے بھی شینہ کے پاس کہاں سے آئے؟"

"ہمارے ملک میں کوئی نہیں پوچھتا کہ اس کے پاس روپیہ کدھر سے آئے۔"

نکس والے بھائی لوگ کا بھی منہ بند ہو جاتا ہے۔ پھر تم کیوں پوچھتا ہے بلا! اس نے تو ایک لاکھ کیا ایک روپیہ بھی نہیں دیا۔ وہ تو کانڈ میں لکھنے کی بات ہے۔ تمہارا شینہ بالی تم سے زیادہ چالاک ہے۔ وہ تمہارے اوپر میں کوئی الزام نہیں آنے دے گا۔

”تم نے ہماری وہ کار ستر ہزار روپے میں خرید لی ہے؟“

”سمجھ لو خرید لیا۔ مگر وہ کار تمہارے پاس میں رہے گا۔ دو دن کے بعد نئے ماڈل کا مرٹیز کار تمہارے پاس آئے گا اور ہم وہ پرانی کار لے جائیں گے۔“

خسرو نے ایک گہری سانس لے کر کہل۔ ”یقیناً اس نے ماڈل کی مرٹیز کے کانڈ سے بھی ایسے ہی بیروا گیری سے تیار کئے گئے ہوں گے۔“

سیٹھ ستار بھائی نے کہل۔ ”تم اپنا سیاست کو دیکھو۔ شینہ بالی کے سلسلے میں مت پرو۔ تم اپنا کچھ نہیں کر سکتے۔ دو سروں کو تو کرتے دو۔“

خسرو نے کہل۔ ”پانچ لاکھ روپے کی کوٹھی ہے۔ تقریباً ایک لاکھ روپے کی نئے ماڈل والی کار ہوگی۔ میری کوٹھی میں پچاس ساٹھ ہزار روپے کے فرنیچر ہیں۔ اس کے علاوہ بھی شینہ بالی نقد رقم آپ سے لے چکی ہے۔ آج ہی اس نے ستر ہزار روپے کا چیک جمع کیا ہے۔ آخر اتنی رقم جو آپ دے رہے ہیں تو کس بھروسے پر؟ کیا آپ کو یقین ہے کہ ہماری پارٹی کا سبب ہوگی اور ہم برسر اقتدار آکر موجودہ حکمرانوں کی طرح لوٹ کھسوٹ چائیں گے اور خوب منافع حاصل کریں گے؟“

”بلا! ہم ادھر سیاست کرنے کو نہیں آتا ہے۔ تم سیاست کرو۔ ہم تجارت کرتے ہیں۔ تجارت سے تمہارا کوئی سروکار نہیں ہے جو لین دین ہو رہا ہے اس کو شینہ بالی پر چھوڑ دو اور اپنا کام کرتے رہو۔“

شام کو وہ گھر آیا۔ شینہ سے بات نہیں کی۔ اس سے ناراضگی ظاہر کرتا رہا۔ کھانے کے وقت میز کے اطراف گھر کے تمام افراد بیٹھ گئے۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے خسرو نے گوشت کے سالن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ گوشت کہاں سے آیا ہے؟“

شینہ نے کہل۔ ”ہم نے خریدا نہیں ہے۔ آپ کے پارٹی لیڈر جبار صاحب کے ہاں بچے کا حقیقہ تھا۔ وہاں سے یہ گوشت آیا ہے۔ کیا ہم حقیقہ کا گوشت بھی قبول نہ کرتے؟“

وہ غصے سے بولا۔ ”میں تم سے نہیں بول رہا ہوں۔“ پھر اس نے اپنی والدہ کی

طرف دیکھ کر کہل۔ ”ای! میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔ میرے سامنے سے ہٹا دیجئے۔“

اس کی ماں نے گوشت کے سالن کی ڈش کو اس سے دور کر دیا۔ شینہ نے سبزی کی ڈش اس کے سامنے رکھ دی۔ خسرو نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ وہ اس کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ گوشت کا سالن بڑے مزے سے کھا رہی تھی۔ سالن میں ایک ٹلی ہاتھ آگئی۔ وہ اس ٹلی کو ہونٹوں کے درمیان رکھ کر چوستے لگی۔ خسرو نے اسے کن اکھیں سے دیکھا۔ پھر کھانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا تو وہ سرخ ہو رہی تھی۔ اس نے غصے سے پوچھا۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟“

وہ بولی۔ ”میں کیا کر رہی ہو؟ اس میں سے گودا نہیں نکل رہا ہے۔ کیا آپ نکالنا پسند کریں گے؟“

خسرو نے ایک گہری سانس لی۔ چپ چاپ سر جھکا کر کھانا چاہا مگر ایک لقمہ بھی منہ میں نہ ڈال سکا۔ اس نے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا پھر اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی امی نے پوچھا۔ ”کیا ہوا بیٹے! کھانا نہیں کھاؤ گے؟“

اس کے والد نے بھی کہل۔ ”بیٹہ جاؤ۔ اگر ہو سے ناراض ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کھانا چھوڑ دو۔“

وہ کوئی جواب دینے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد شینہ بھی کھانا چھوڑ کر اٹھ گئی۔ اپنے سانس سر سے معذرت کرتے ہوئے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد سانس لے کر کہل۔ ”بھرا جینا پہلی بار ہو سے ناراض دکھائی دیتا ہے۔“

چھوٹی بیٹی نے کہل۔ ”ای! بھائی جان بہت چالاک ہیں۔ بہت اچھی ہیں۔ بھائی جان کو سیدھا کر کے رکھ دیا ہے۔“

کھانے کے بعد بڑی بی بی بچن میں آئیں۔ وہاں ایک ٹرے پر دودھ سے بھرا ہوا جگ اور دو گلاس رکھے۔ پھر اس ٹرے کو اٹھا کر بیٹے اور بہو کے دروازے پر پہنچیں۔ دروازہ بند تھا۔ اندر سے دونوں کے چہنے بولنے کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بڑی بی بی خوش ہو گئیں۔ وہاں سے پلٹ کر بچن میں آگئیں۔ اب بوٹی ٹولی تو نہیں تھی۔ خود ہی اگر دودھ لے جاسکتی تھی۔

دسمبر کے آخری ہفتے میں نتیجہ ظاہر ہو گیا۔ منگائی خدہ کی تحریک بظاہر کامیاب ہوئی

تھی، باطن ناکام رہی تھی۔ لوگوں کی اکثریت نے دکانوں سے گوشت نہیں خریدا تھا لیکن قصابوں کی دکانوں سے گوشت بکنا رہا تھا۔ لوگ ۳۱ دسمبر کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ وہ تحریک کا آخری دن تھا۔ جنوری کی پہلی تاریخ سے پھر گوشت کھانے کی اجازت مل جاتی لیکن ۳۰ دسمبر کو شہر کے تمام قصابوں نے اعلان کیا کہ جنوری کی پہلی تاریخ سے وہ غیر معینہ مدت کے لئے ہڑتال کریں گے۔ جب تک حکومت کی طرف سے گوشت کی قیمت میں دو روپے فی کلو اضافہ نہیں ہوگا۔ اس وقت تک ہڑتال جاری رہے گی۔

سارے شہر میں کھلی بچ گئی۔ جنوری کی پہلی تاریخ سے گوشت بالکل ناپود ہو گیا۔ پچھلے ایک ماہ تک گوشت دکانوں میں نظر آتا تھا اور لوگ بظاہر نہیں خریدتے تھے چور دروازوں سے گوشت مل جاتا تھا۔ وہ چور دروازے بھی بند ہو گئے تھے موبیشیوں کی قیمت اچانک ہی آسمان سے ہاتس کرنے لگی تھی۔ ایک دو آدمیوں کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ کمریا لگائے خرید کر لائے اور بھٹوں بیٹھ کر اسے کھاتے۔ کسی محلے سے جس آدمی سو سو روپے چندے کے طور پر جمع کرتے تھے۔ پتہ چلتا تھا دو ہزار میں ایک مرل لگائے آئے گی جس کا گوشت بیس آدمیوں میں اس طرح تقسیم ہو گا کہ شاید ایک آدمی اپنے گھر والوں کے ساتھ تین وقت بھی گوشت ہی بھر کر نہ کھا سکے۔

چار دن کی ہڑتال کے بعد ہی حکومت نے ان کا مطالبہ منظور کر لیا اور گوشت کی قیمت بڑھ گئی۔ لوگ گوشت کھانے کے لئے بے قرار تھے اس لئے دکانوں میں پہلے سے زیادہ میلہ لگ گیا۔ منگائی کی شکایت کچھ لوگوں نے دہلی زبان سے کی لیکن منہ مالگی قیمت پر گوشت خرید کر کھانے لگے اور خوب کھانے لگے۔

اسے بی خسرو نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کہا۔ ”شینہ! یہ کیا ہو گیا۔ ساری مہینہیں الٹی ہو گئیں۔“

”آپ کے نقطہ نظر سے شاید آپ ہلکی محسوس کر رہے ہیں لیکن ہمارے نقطہ نظر سے آپ بے حد کامیاب ہو رہے ہیں۔“

خسرو نے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

”آپ کی چاروں بہنوں کے رشتے جہاں سے آئے ہیں ان میں سے ایک لڑکا آم کے باغات کا مالک ہے۔ ایک لڑکا کینو اور شکرے کے باغات کا مالک ہے۔ آپ نے صدر جام‘

جیلی اور اچار بنانے والوں کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ وہ لوگ کتنے دولت مند ہیں۔ وہ اپنے صاحبزادوں کے لئے آپ کی بہنوں کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔“

”عجب ہے۔ اتنے بڑے لوگ میرے گھر میں جھانک رہے ہیں۔ آخر ہم میں کیا سرخاب کے پر لگ گئے ہیں۔“

”کچھ نہیں، بس تجارتی انداز کی سودے بازی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ پھلوں کی منگائی کے خلاف تحریک چلائیں، اس طرح پھل کچھ اور سستے ہوں گے۔ جام‘ جیلی اور اچار وغیرہ کی بھی قیمتیں بڑھ جائیں گی۔“

خسرو نے حیرانی سے کہا۔ ”اوہ خدایا! اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تحریک سیاسی طور پر ناکام رہی اور تجارتی طور پر بڑی ہی کامیاب ثابت ہو رہی ہے۔“

”اسی لئے میں کاروباری انداز میں اپنے لئے راہیں ہموار کرتی آرہی ہوں۔ یہ عقل مجھے سینہ ستار بھائی نے دی ہے۔“

”وہ کیسے؟“

شینہ نے اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”جس روز ہم پہلی بار اوپن ایئر ریسٹوران میں ملے تھے۔ اس سے پہلے دن کے وقت سینہ ستار بھائی دفتر میں مجھ سے ملنے آئے۔ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ کس طرح کاروباری انداز میں مجھ سے سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ آپ کے پارٹی لیڈر جبار صاحب منگائی ٹھاہر کی تحریک کے خلاف تھے۔ سینہ ستار بھائی کو اعترض تھا کہ آپ یہ تحریک شروع نہیں کریں گے اور جبار صاحب سے متعلق ہو کر اس کا پردہ گرام بدل دیں گے۔ اس طرح سینہ ستار بھائی اور خفار بھائی کو بڑا نقصان پہنچنے والا تھا۔“

خسرو نے پوچھا۔ ”ان دونوں کو کیا نقصان پہنچ سکتا تھا؟ اور اب کیا فائدہ پہنچا ہوگا؟“

”آپ تو جانتے ہیں کہ سینہ ستار بھائی اور سینہ خفار بھائی بنا سستی تھی کا کاروبار کرتے ہیں۔“

”ہاں، جانتا ہوں۔“

”تو پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ پورے ایک ماہ تک گوشت کی فروخت بظاہر بند رہی۔ حکومت کے سامنے یہی شکایت کی گئی کہ قصابوں نے گوشت فروخت نہیں کیا۔“

جلی بنانے والے خود ہی آپ کا ساتھ دیں گے۔ حکومت کے سامنے ظاہر کریں گے کہ بازار میں ان کی چیزوں کے خریدار نہیں ہیں۔ اسے 'جی خسرو' کی تحریک کامیاب جاری ہے۔ اس کے بعد آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ کس طرح حکومت کے سامنے اپنے نقصانات کی فہرست پیش کریں گے اور اپنی مصنوعات کی قیمتیں بڑھائیں گے۔

"اس طرح تو میں سیاست سے بالکل ہی دانش آؤٹ ہو جاؤں گا۔"

"میں یہ نہیں چاہتی۔ میں نے ایک راستہ اور بھی بنا رکھا ہے اور وہ ہے موجودہ حکومت سے سمجھوتہ۔ بڑے بڑے عہدیداروں سے میری دوستی ہو چکی ہے۔ وہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں اور آپ کو ایک بہت بڑا سرکاری عہدہ دینا چاہتے ہیں اس طرح آپ موجودہ سرکار کی طرف سے سیاست میں حصہ لیتے رہیں گے۔ اور بازار یہ موجودہ معیار زندگی بھی برقرار رہے گا بلکہ معیار بڑھتا ہی جائے گا۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ مجھے اچانک ہی اتنا بڑا سرکاری عہدہ کیسے مل جائے گا اور کیوں ملے گا؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "منگائی فلاح کی تحریک نے حکومت کو بھی غصا پریشان کیا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بجٹ کا اعلان ہونے سے کچھ پہلے منگائی بڑھتی ہے لیکن ابھی بجٹ کے اعلان کو چھ ماہ کا عرصہ باقی ہے۔ اس سے پہلے ہی آپ کی تحریک سے منگائی بڑھ گئی۔ آپ نے دوسری تحریک چلائی تو منگائی پھر بڑھے گی۔ لوگ حکومت کے خلاف نعرے لگائیں گے۔ دوسری سیاسی پارٹیاں اس موقع سے فائدہ اٹھائیں گی۔ اس لئے حکومت انکیشن سے پہلے آپ جیسے لوگوں سے سمجھوتہ کر رہی ہے۔ اسی سمجھوتے کے نتیجے میں آپ کو آپ کی مرضی کے مطابق بہت بڑا عہدہ دیا جائے گا اور ہمیں اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔"

خسرو تھوڑی دیر تک شینہ کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "آج تم نے یہ ثابت کر دیا ہے، 'مرد مشرق کی طرف جانا چاہتا ہے' عورت اسے مغرب کی طرف لے جاتی ہے۔ منگائی فلاح کی ناکامی کی وجہ تم اور صرف تم ہو۔"

"آپ لوگ عورت کو الزامات دیتے ہیں اور دیتے رہیں گے کبھی حقیقت کو تسلیم کرنے کی توفیق ہو تو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ 'پردے میں رہنے دو' سے منگائی

جانور ذبح نہیں کئے۔ جانوروں کی چربی آؤٹ آف مارکیٹ ہو گئی۔ چربی کے بغیر بنا سکتی تھی تیار نہیں ہو گا۔ اس لئے کاروبار میں اتنا خسارہ ہوا ہے کہ کھجور کی قیمت بڑھائے بغیر اس خسارے کو پورا نہیں کیا جاسکتا آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ بنا سکتی کھجور کی قیمت میں بھی اضافہ ہو چکا ہے۔ ڈھائی کلو کا ایک چھوٹا ڈب جو اٹھارہ روپے میں ملتا تھا اب اس کی قیمت بائیس روپے ہو گئی ہے۔ سیٹھ ستار بھٹی نے ہم پر زیادہ سے زیادہ سات یا ساڑھے سات لاکھ روپے خرچ کئے ہیں اور اب ستر لاکھ روپے کما رہے ہوں گے۔"

"اور مائی گاڑا! میں نے دوسرے دھیان نہیں دیا تھا کہ مویشیوں کا تعلق بنا سکتی کھجور سے ہوتا ہے۔ اگر ذرا بھی دھیان دیتا تو میں کی چال سمجھ میں آجاتی لیکن اب میرے سیاسی کیریئر کا کیا ہو گا؟"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں پہلے ہی سمجھ چکی تھی کہ آپ ناکام ہوں گے تو میرے ذریعے کامیابی حاصل ہوگی اور اگر منگائی فلاح کی تحریک میں کامیاب ہو جاتے تو یوں بھی آپ کا سیاسی کیریئر بلند ہو جاتا آپ پر آج بھی نہ آتی۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ نے ستار بھٹی سے رشوت لی ہے۔ میں نے اپنے لین دین کے پیچھے کوئی کمزوری نہیں چھوڑی ہے۔"

"اور اب تم چاہتی ہو کہ میں جام، جیلی اور اجار والوں سے رشتہ کروں۔ آئندہ پہلوں کی منگائی کے خلاف تحریک چلاؤں۔ لوگ اتنے بھان نہیں ہیں۔ وہ اب میرا ساتھ نہیں دیں گے۔"

"دیکھئے گوشت کی تحریک کا تعلق امیر اور غریب سب سے تھا۔ غریبوں نے آپ کا بھرپور ساتھ دیا لیکن پہلوں اور جام، جیلی وغیرہ کا تعلق امیر طبقے سے ہے۔ غریبوں کا تعلق صرف اجار اور چٹنی سے ہے۔ اس بار امیر طبقے کے لوگ آپ کی تحریک میں ساتھ دیں گے۔"

"دولت مند کبھی ساتھ نہیں رہیں گے۔ وہ لوگ منگائی سے منگائی چیزیں خرید لیتے ہیں۔"

"آپ میری بات پوری طرح سن لیجئے۔ بے شک امیر طبقے کے لوگ آپ کا بھرپور ساتھ نہیں دیں گے۔ آپ کو تو بس تحریک کا اعلان کرنا چاہیے۔ باقی پھل والے اور جام

شروع ہوتی ہے اور جلوہ نکالی کی انتہا تک پہنچ کر اس منگائی سے نکاح قبول ہوتا ہے۔
اے 'جی' خسر نے اسے نظر بھر کر دیکھا تب انکشاف ہوا کہ نظر نہیں بھرتی۔ جلوہ
بیاں بڑھانے کے لئے ہوتا ہے۔

☆=====☆ ختم شد =====☆

حالات

ان لوگوں کی کہانی جن کے پیروں میں حالات کی زنجیریں پٹ جاتی ہیں۔
روز عورتیں اپنی اپنی کوکھ میں ایک ہی مرد کا بچہ لئے ہوئے تھیں۔ پتہ نہیں مرد کس
کی طرف جھپکنے والا تھا۔
اس عورت کی جبریتاً کہانی جس کی سماگ رات اعمال کی حسب رات بن گئی
تھی۔
ایک کنواری ماں کا قصہ جسے اپنے ہونے والے بچے کیلئے ایک بات کی ضرورت
تھی۔
وہ بچہ تنہا ب کے منہ پر چلی کالک تھا جو کسی کے منہ پر چلی جھوٹی کالک دھو رہا تھا۔

مٹوکل آتے تھے جو منہ مانگی نہیں ادا نہیں کر سکتے تھے کبھی سوٹا کبھی کی طوائفیں اپنے کسی کس میں اس کے پاس عزت کے لئے آتی تھیں۔ کبھی کوئی خون خرابہ والا کس آتا تھا لیکن پولیس والے اوپر ہی اوپر فریقین سے اچھی خاصی رقم لے کر اس کس کو عدالت تک پہنچنے سے پہلے ہی دبا دیتے تھے۔ پرتی کی ہونے والی آمدنی ایک جھگڑے سے ختم ہو جاتی تھی۔ وہ حیرانی سے سوچتی تھی کہ دوسرے وکلا کو دولت مند مٹوکل کیسے مل جاتے ہیں جو قہالے میں سمجھوتہ نہیں کرتے، اپنا مقدمہ عدالت میں لڑتے ہیں اور اپنے وکلا کی مستقل آمدنی کا ذریعہ بنے رہتے ہیں۔

پرتی ہلا کی یہ حیرانی رفتہ رفتہ دور ہونے لگی۔ اس کے پاس اچانک ہی جانے کیسے دولت مند مٹوکل آئے گئے۔ وہ خوش لباس ہوتے تھے اور کاروں میں آتے تھے۔ ان کے پاس بڑی بڑی جائیداد اور بڑی بڑی کمپنیوں کے شیئرز کے معاملات تصفیہ طلب ہوتے تھے اور وہ اپنے معاملات کو نمٹانے کے لئے پرتی کو منہ مانگا معاوضہ دیتے تھے۔

وہ اپنے دولت مند مٹوکلوں سے کبھی کبھی دریافت کرتی تھی۔ ”آپ نے میرا نام کہاں سے سنا تھا؟ آپ کو میرا پتہ کیسے معلوم ہوا؟ آپ نے کیسے یقین کر لیا کہ میں آپ کا کام بخشن و خولی انجام دے سکوں گی؟“

اس کے مٹوکل جواب دیتے تھے۔ کوئی کہتا۔ ”میں نے آپ کے متعلق پڑھا تھا۔“ کوئی سوچنے کے انداز میں بولتا۔ ”میں نے کسی تقریب میں آپ کا ذکر سنا تھا۔“ آخر ایک مٹوکل کی زبانی سے سچی بات نکل گئی۔ وہ رہائی میں کہہ گیا۔ ”مجھے آپ کے پاس آنے کا مشورہ خجے صاحب نے دیا ہے۔“

”خجے صاحب؟“ پرتی نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا خجے مکرئی صاحب؟“ اس مٹوکل نے جھجکاتے ہوئے کہا۔ ”جی ہاں۔ مگر انہوں نے کہا تھا کہ میں آپ کے سامنے ان کا ذکر نہ کروں۔ آپ اس بات کو ہمیں فہم کریں۔“

بات فہم کیسے ہوئی؟ ابھی تو ابتدا ہوئی تھی۔ پرتی کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنا دولت مند اتنی ادنیٰ سیاسی شخصیت کا مالک اس پر احساسات کیوں کر رہا ہے؟ چپ چاپ اس کی آمدنی میں اضافہ کیوں کر رہا ہے؟ اگر یہ سوالی اس لئے ہے کہ وہ جوان دوشیزا ہے تو اس نے پھر کبھی ملاقات نہیں کی۔ کسی بھانجے..... رابطہ

پرتی بالائیوں تو کچھ زیادہ حسین نہیں تھی مگر نشہ کی طرح آہستہ آہستہ دل و دماغ کو متاثر کرتی تھی۔ پہلی ملاقات میں اپنی شخصیت کا ”پیش لفظ“ چھوڑ جاتی تھی۔ بعد میں تحریک پیدا ہوتی تھی کہ پوری کلب پڑھنا چاہئے۔

وہ وکالت کر رہی تھی ایک مقدمہ کے دوران اس سے ایک ایسی غلطی ہو گئی جس سے قانون کے احکام کو نہیں پہنچتی تھی۔ شاید اس سے وکالت کے حقوق چھین لئے جاتے لیکن..... کلکتہ بار کی ایک بہت ہی اہم اور معزز شخصیت خجے مکرئی نے اس کی طرف سے وکالت کی اور یہ ثابت کر دیا کہ پرتی ہلا نے اپنے مٹوکل کی ممانعت میں دانستہ قانون کو ملامت نہیں کی تھی۔ وہ ایک جذباتی اور بے اختیار ہات تھی جو زبان سے نکل گئی تھی جس کے لئے پرتی ہلا معافی کی طلبکار ہے۔

پرتی ہلا کی غلطی معاف کر دی گئی تھی۔ اس کس کے دوران خجے مکرئی نے اس سے مختصر ملاقات کی تھی۔ پرتی ہلا کو اوپر سے پیش لفظ کی طرح پڑھا تھا۔ بعد میں شام کو وہ اپنی عادت کے مطابق بوسہ کی بوتل کھول کر بیٹھا تھا تو وہ یاد آئے لگی۔

اسے تعجب ہوا کہ پہلے اس میں یاد آنے والی خوبیاں نظر کیوں نہ آئیں۔ وہ کسی بات پر بڑی گنجوی سے مسکراتی تھی۔ جیسے یونانی مسکراہٹ کی بھیک دے رہی ہو۔ اب حسن کی وہ سلطنت جیسے کسی خلا کو پُر کر رہی تھی۔ وہ بہت دھیسے خروں میں بولتی تھی۔ اب وہ سر دل کے تاروں کو چھیڑ رہے تھے۔ وہ جھجک کے بعد یاد آیا کہ وہ حسین ہی نہیں پرتی صاحب بھی تھی اور اس کا شباب بڑا ہی ٹیسیں پہنچانے والا تھا۔ سیاسی حلقوں میں خجے مکرئی بہت اونچی شخصیت کا مالک تھا۔ آئندہ انتخابات میں حصہ لینے والا تھا۔ اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ ایک عام آدمی کی طرح عاشق بن کر پرتی ہلا میں دلچسپی نہیں لے سکتا تھا۔

ان دنوں پرتی ہلا کی وکالت برائے نام چل رہی تھی۔ اس کے پاس ایسے غریب

قائم نہیں کیا۔ اس کے برعکس وہ خود کو چھپا رہا تھا۔ کسی سوکل کی زبان سے بھی اپنی مرمائی کا بھید نہیں کھولنا چاہتا تھا۔

کمرتی صاحب کے اسی انداز نے بے حد متاثر کیا۔ اب پریتی کا فرض تھا کہ ان کا شکریہ ادا کرتی۔ وہ سوچنے لگی کس طرح شکریہ ادا کرے۔ اتنے مصروف آدمی سے شاید فون پر ہی دو چار باتیں ہو سکتی تھیں۔ وہ شکریہ کے لئے دو چار فقرے تراشنے لگی۔ دل ہی دل میں ان فقروں کو ادا کرنے کی دہرسل کرنے لگی۔ وہ اپنے سوکلوں کی حمایت میں جج صاحبان کے آگے بے ٹکان بولتی تھی۔ کبھی کسی کے عہدے اور شخصیت سے متاثر نہیں ہوتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ بچے کمرتی سے فون پر کچھ بولنے وقت خود کو بہت چھوڑا۔ بہت کتر محسوس کر رہی تھی۔

اچھی طرح دہرسل کرنے کے بعد اس نے بچے کمرتی کے نمبروں پر فون کیا۔ دوسری طرف سے اس کے سیکریٹری نے جواب دیا۔ ”کمرتی صاحب تین ماہ کے لئے یورپ کے دورے پر گئے ہیں۔“

جانے کیوں پریتی کو ایسا لگا جیسے بچے کے چلے جاتے سے وہ کچھ ہار گئی ہے۔ یہ عجیب سا احساس تھا۔ جبکہ بچے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس نے تین ماہ تک بڑی بے مبری سے انتظار کیا جس طرح گلے میں ہڈی اٹک جاتی ہے، اسی طرح شکریہ کے بول اٹکے ہوئے تھے۔ انتظار کی مدت ختم ہونے کے بعد اس نے پھر فون کیا۔ جواب ملا۔ ”کمرتی صاحب جنوبی امریکہ میں ہیں۔ اگلے ماہ تک واپس آئیں گے۔“

اس بار اس نے مایوس ہو کر سوچا۔ ”آخر ایسی بے مبری بھی کیا؟ اب میں اسے فون نہیں کروں گی۔ کبھی اخبارات کے ذریعے پتہ چلے گا کہ وہ شہر میں موجود ہیں تو پھر دیکھا جائے گا۔“

یہ فیصلہ کرنے کے باوجود وہ بچے کو نہ بھلا سکی۔ اسے پتہ چلا کہ وہ چار ماہ سے شکریہ ادا کرنے کے لئے اپنے من مندر میں اس کے نام کی ملاپ رہی ہے۔ یعنی شکریہ کے رسمی تکلف سے آگے نکل گئی ہے۔ اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ ”یہ اچھی بات نہیں ہے۔ کیا میں اتنے بڑے آدمی کی دلہن بننے کے خواہش رکھتی ہوں؟ نہیں۔ وہ یقیناً شادی شدہ ہوں گے اور ان کے کئی بچے ہوں گے۔“

اس کے دل نے منہ کی۔ ”اگر بیوی بچے ہوتے تو کبھی نہ کبھی اخبارات میں ان کا ذکر ہوتا۔“

اس نے پھر دل کو سمجھایا۔ ”سیاست میں حصہ لینے والے اپنے گھریلو معاملات کو اخبارات تک پہنچنے نہیں دیتے۔ کمرتی صاحب نے بھی یہی کیا ہو گا۔ نہیں، میرا دماغ چل گیا ہے۔ کمرتی صاحب نے ایک مرمائی کی ہے تو میں پاگل بننے دیکھنے لگی ہوں۔ بس اب ایک بار رسمی طور پر شکریہ ادا کر کے سب کچھ بھول جانا چاہئے۔“

مگر وہ شکریہ ادا ہونے نہیں پا رہا تھا۔ بچے کمرتی یورپ اور امریکہ سے واپس آکر مدیہ، پریش، اڈیبر اور مدراس کا دورہ کر رہا تھا۔ یعنی جتنے عرصہ تک دور رہا تھا۔ اتنا ہی اس کے دل میں گھسا جا رہا تھا۔ انہی دنوں پریتی ایک قتل کے مقدمہ میں مصروف ہو گئی۔ اس مقدمہ نے پریتی بلا کا نام اخبارات کے پہلے صفحہ پر شہ مرفیوں کے ساتھ پہنچایا۔

قتل کی واردات جیل خانہ کے اندر ہوئی تھی۔ ایک قیدی نے دوسرے قیدی کو قتل کر دیا تھا۔ وہ قیدی جو قاتل تھا، وہ اب پریتی کا سوکل تھا۔ اسے بے گناہ ثابت کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ سرکاری وکیل اسے چھانسی کے تختے تک پہنچانے کے لئے ایڈی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ پریتی نے نہایت ذہانت سے یہ ثابت کیا کہ قاتل قیدی شریف گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ جیل کے ریکارڈ نے بتایا کہ اس سے شریف اور معزز لوگ ملنے آتے تھے۔ جبکہ مقتول قیدی سے غنڈے اور بد معاش صرف ملنے ہی نہیں آتے تھے بلکہ اس کے لئے جس دغیرہ بھی لاتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں نے مقتول کے پاس وہ چاقو پہنچایا تھا۔ لڑائی جھگڑے کے دوران وہ چاقو پریتی کے سوکل کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے اپنی حفاظت کی خاطر مقتول کو زخمی کیا۔ قتل کا ارادہ ہرگز نہ تھا۔ وہ زخمی ہسپتال پہنچائے جانے تک مر گیا تھا۔

جیوری قاتل ہو گئی کہ پریتی کا سوکل جیل کی سلاخوں کے پیچھے مجبور تھا۔ اس نے اپنی حفاظت کی خاطر اپنے مقابل کو بلکہ حملہ آور کو محض زخمی کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے ذہنوں کی تاب نہ لا کر مر گیا۔ بہر حال اس نے اپنے سوکل کو سزائے موت سے بچالیا۔ اخبارات نے پریتی بالا کے اس کارنامے کا بڑا چرچا کیا اور پریتی کو اس کا انعام یہ ملا

وہ ”جی۔“ کہہ کر رہ گئی۔ بچے نے پوچھا۔ ”ڈنر کے لئے ہفتہ کی رات کیسی رہے گی؟“

اس کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ ہفتہ میں..... ابھی دو دن باقی تھے۔ یہ دو دن کیسے گزریں گے؟ وہ آہستگی سے بولی۔ ”ٹھیک ہے۔“

”کیا میں تمہارے گھر سے تمہیں لے چلوں؟“

اس نے سوچا۔ میرا چھوٹا سا کالج ایسا نہیں ہے کہ بچے جیسا بڑا آدمی وہاں آئے مجھے تنگی محسوس ہوگی۔

وہ جلدی سے بولی۔ ”آپ کو رحمت ہوگی۔ مجھے جبکہ ہادیں میں بھیج جائیں گی۔“

”کیا تم کل ریسٹورنٹ کا کھانا پسند کر دو گی؟“

”وہاں کا کھانا ٹھیکنے کے بعد ہی پسند کر سکتی ہوں۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک آٹھ بجے۔“

”میں وقت پر پہنچ جاؤں گی۔“

دوسری طرف سے ریسپورر رکھ دیا گیا۔ پرچی اپنے ریسپورر کے ساتھ یوں کم کم بیٹھی رہی جیسے بچے کا ہاتھ تھامے کہیں دور پہنچ گئی ہو۔ وہ دلی دلی میں کہہ رہی تھی۔ ”یہ بچے کے ساتھ مضحکہ خیز دلچسپی ہے۔ وہ یقیناً بڑی دالا ہوگا اور اس کے کم از کم درجن بھر بچے ہوں گے۔“

اس کے معاون کرم چند نے دفتر میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”ماسٹر باورنی کے سلسلہ میں کیا خیال ہے؟“

پرچی نے خیالات سے چونک کر ریسپورر..... کریڈل پر رکھ دیا۔ پھر کہلا۔ ”کرم چند! ایک شخص کے متعلق تحقیقات کرنا۔ اس کا نام بچے مگر جی ہے۔“

اس نے کہلا۔ ”اس کے متعلق بھلا کیا معلوم کرنا ہے۔ آپ اخبارات میں پڑھ لیا کریں۔ ساری معلومات حاصل ہو جائیں گی۔“

”تم کیا جانتے ہو؟“

”میری معلومات کے مطابق وہ خاندانی رئیس ہے۔ فولاد کے ایک کارخانے کا مالک ہے۔ بہت بڑا دیکل اور سیاست دان ہے۔ اس نے بنگال لاء اسکول قائم کیا ہے۔“

کہ اسی شام بچے مگر جی نے اسے فون پر مخاطب کیا۔ ”ہیلو میں نے سوچا کہ اتنی زبردست کامیابی پر تمہیں مبارکباد دوں۔“

پرچی کے دل کی دھڑکنیں ایک بارگی تیز ہو گئیں۔ اسے یقین کی حد تک شبہ ہوا کہ وہ بچے مگر جی کی آواز ہے۔ کیونکہ وہ اس آواز کو چھ ماہ سے اپنے اندر سنتی آرہی تھی۔ اس کی خاموشی پر دوسری طرف سے بچے نے کہلا۔ ”میں بھی عجیب ہوں۔ پہلے مجھے اپنا نام بتانا چاہئے تھا۔ میرا نام.....“

وہ بے اختیار بول پڑی۔ ”میں جانتی ہوں۔“

یہ کہتے ہی وہ ہریشان ہو گئی کہ اس نے ایسا کیوں کہا؟ کیا بھلا کہنے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ چھپتا رہا اور وہ..... جاننے پہچاننے کی حد تک سوچ کی مگر جی میں اسے تلاش کرتی رہی۔ یہ ٹھیک ہے کہ عورت کسی کو جی جان سے چاہے۔ مگر یہ بھید نہ کھولے کہ چاہت میں اس نے پہل کی ہے۔

بچے نے کہلا۔ ”میں اخبارات میں پوری تفصیل پڑھتا رہا ہوں جس انداز سے تم اس مقدمہ کو چنڈل کر رہی تھیں! اس سے میں نے کچھ لیا تھا کہ جیت تمہارا مقدمہ بنے گی۔“

”شکریہ۔ یہ سب آپ کی بہت افزائی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔ آگے کیا کہے؟ سمجھ میں نہ آیا۔ یوں دیکھا جائے تو بات فتم ہو چکی تھی۔ اس نے مبارکباد دی تھی۔ اس نے شکریہ ادا کیا تھا! اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوچا۔ کیا وہ ریسپورر رکھ دے گا؟ کیا اور کچھ کہنے کے لئے اس کے دل میں کوئی بات نہ ہوگی؟

پھر اس نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ ”کیا تم بھی میرے ساتھ رات کا کھانا کھانا پسند کر دو گی؟“

پرچی نے گھڑی دیکھی۔ چھ بجے تھے۔ دو گھنٹے بعد رات کے کھانے کا وقت شروع ہو جائے گا۔ کیا دو گھنٹے بعد وہ اس کے سامنے بیٹھی ہوگی۔ اس نے کہلا۔ ”جی۔ جی ہاں۔ یہ آپ کی عزت افزائی ہوگی۔“

”تم بہت ہی عطفانہ الفاظ استعمال کر رہی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ ڈنر کے وقت ہم بڑے چھوٹے نہ ہوں۔ ٹوبی دیری فرینک میں دوستانہ ماحول چاہتا ہوں۔ ٹھیک ہے؟“

پرتی نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ”اور کیا جانتے ہو؟“

”اور یہ کہ آئندہ بھارتی سینٹ کے لئے امیدوار ہو گا سیاسی حلقوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ اسے حکمران پارٹی کی حمایت حاصل ہے۔“

پرتی نے دل میں کہا۔ یقیناً وہ حکمران پارٹی اور عوام میں یکساں مقبول ہے۔ بھگوان سے میری پراگتھا ہے اسے کامیابی ہوگی۔

پھر اس نے کرم چند سے اپنے دل کی بات پوچھی۔ ”اس کی ذاتی یعنی کہ گھریلو زندگی کیسی ہے؟“

”کسی کی گھریلو زندگی میں جھانکنا ذرا مشکل ہے۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ اس کی ایک بیوی ہے۔ بچے نہیں ہیں۔“

پرتی کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے چہرے سے ڈوبنے کا عدم صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ کرم چند نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”آں۔ کچھ نہیں۔ بس تم جاؤ۔“

کرم چند کے جانے کے بعد وہ بڑی دیر تک سوچتی رہی۔ ”کیا مجھے نے محض رسا کھانے کی دعوت دی ہے؟ وہ مجھے مبارک باد دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے فون پر یہ رسم ادا کر دی ہے۔ پھر دعوت کا مقصد کیا ہے؟ کیا مل بیٹھنے کا بہانہ ہے؟“

وہ بڑے اضطراب میں جٹا ہو گئی تھی۔ ”میں نے کئی ماہ پہلے انہیں ایک ہی بار دیکھا ہے۔ اب دوسری بار دیکھوں گی۔ کیا وہ مجھے تائیں گے کہ ان کی شادی ہو چکی ہے؟ ان کا فرض ہے کہ وہ مجھے بتائیں لیکن اکثر مرد کسی جوان لڑکی کے سامنے اپنی بیوی کا ذکر آنے نہیں دیتے۔ کچھ بھی ہو۔ مجھے ہفتہ کی رات وعدہ کے مطابق ملاقات کرنا ہے اور یہ ملاقات آخری ہوگی۔“

ہفتہ کا دن بہت دور لگ رہا تھا۔ جیسے وہ ملاقات کی شام سوسل بعد آنے والی ہو۔ کسی کام میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ کسی مقدمہ پر توجہ دینا چاہتی تو بچے سامنے آکر بیٹھ جاتا اور وہ ساری دنیا کو بھول جاتی۔ اس کی حالت بڑی مضحکہ خیز تھی۔ یہ دیوانگی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ایک ہی بار اسے دیکھا تھا اور بار بار اسے ذہن سے نکالنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

اس نے اپنی اس دیوانگی کا تجربہ کیا۔ پہلے یہ بات سمجھ میں آئی کہ بچے مکرئی نے ایک بار اسے قانون کی نظروں سے گرنے سے بچایا تھا۔ اس لئے وہ احسان مند ہے۔ پھر بچے اس کے پاس دولت مند موکل بھیجتا رہا تھا۔ مزید احسانات کرتا رہا تھا۔ بڑی خاموشی سے اس کے کام آ رہا تھا۔ اس لئے وہ بے حد متاثر ہو گئی تھی لیکن احسان مند ہونا اور بات ہے اور متاثر ہونا اور بات ہے اور اس کے دل میں کچھ اور ہو رہا تھا جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اس کے اندر کچھ ایسے جذبے اٹھرائی لے رہے تھے جو پہلے کہیں خوابیدہ تھے۔ اس نے کبھی کسی کی ذات میں کشش محسوس نہیں کی تھی۔ اتنی بڑی دنیا میں وہی ایک سو تھا جو رست اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

آخر ہفتہ کی وہ طلسمانی رات آگئی۔ وہ صبح سے گھبراہٹ مچھرائی سی تھی۔ ایک کپ چائے پی کر شاپنگ کے لئے گھر سے نکل گئی تھی۔ اپنے سنگار کے لئے کچھ خریدنے کا ارادہ تھا لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا خریدے؟ اور کس انداز میں سنگار کرے؟ وہ دوسرے سے پہلے گھر واپس آگئی۔ ڈر تھا کہ دھوپ میں گھونسنے سے اس کی گوری رنگت جل جائے گی۔ چار بجے تک وہ بچے سے خیالی گفتگو میں مصروف رہی اور اچھے اچھے فقرے یاد کرتی رہی۔ پھر اس نے ہاتھ تک نب میں صابن کا جھاگ بنایا۔ اس میں روز اور جسمین کی خوشبو ملائی۔ پھر اس جھاگ میں گردن تک ڈوب کر بیٹھ گئی۔

ایک گھنٹہ بعد جب وہ غسل خانہ سے باہر آئی تو اس کے بدن سے مدھوش کر دینے والی خوشبو انگڑائیاں لے رہی تھی۔ اس نے بلاؤز اور بیٹی کوٹ پہننے کے بعد وہ آئینوں کے درمیان بیٹھ کر کنول کی صورت میں بالوں کا بڑا سا جوڑا باندھا پھر ہلکے گلابی رنگ کی سنہری ہاؤر والی ساڑھی پہنی اور ایسے عمدہ سلیقے سے پہنی کہ خوبصورت بدن اپنے جیسے کے ساتھ نمایاں ہو گیا۔ جوڑے میں اس نے سفید پھولوں کی دینی سجائی۔ سفید اسٹیشن پھولوں کی بڑی بڑی بالیاں کانوں میں پہنیں۔ گلے میں ہار ہاتھوں میں نگن اور چڑیاں ہونٹوں پر لالی آنکھوں میں کاجل اور ماتھے پر سونے کی ہندیا لگائی۔ آگے پیچھے دونوں آئینے اس کے جلوؤں سے بھر گئے تھے۔ اس کے ہار سنگار سے جبکا رہے تھے۔ اسے اپنے حسن کی چکا چوند سے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خود کو کہاں کہاں سے دیکھے؟ جہاں جہاں سے بھی دیکھے نقش رہ جائے گی اور حسن کی بقا اس میں ہے کہ دیکھنے والی آنکھوں کی پیاس کبھی نہ

”اس کا نام نہ ملا ہے۔ ہماری شادی کو چند برس گزر چکے ہیں، بہت کم عہری میں شادی ہوئی تھی، اب تک کوئی اولاد نہ ہو سکی۔ شاید وہ بانجھ ہے۔“

”اولاد کی خواہش ہوئی تو ہوگی؟“

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ”اولاد کی خواہش کسے نہیں ہوتی؟ میرے بعد میرا نام لینے والا کوئی ہونا چاہئے۔“

”نرملہ دیوی بھی یہی سوچتی ہوں گی۔“

”ایک بانجھ عورت کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ وہ ایک آدمہ ہار کہہ چکی ہے کہ میں اسے طلاق دے کر اولاد کے لئے دوسری شادی کر لوں۔“

پریتی کو اندر سے اطمینان ہوا۔ بچے کمری کی جیون ساتھی بننے کی تھوڑی سی گنجائش نکل آئی تھی لیکن یہ اسے اچھا نہ لگا کہ اس کے کارن ایک بیابا عورت کو طلاق ہو جائے۔ یہ نرملہ پر ظلم ہو گا۔ وہ بولی۔ ”آپ بہت اچھے ہیں۔ میں آپ کی کمی محسوس کر رہی لیکن آئندہ کبھی نہیں ملوں گی۔“

”میں بھی نہیں چاہتا کہ کبھی میری ذات سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچے۔ میں تمہاری صلاحیتوں سے متاثر ہوں۔ تمہیں بام عروج پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ پریتی! تمہیں میری ضرورت ہے۔ ہم روز نہیں ملیں گے مگر کبھی کبھی تو ہمیں ملنا چاہئے۔ کبھی کبھی ٹھیک رہے گا؟“

وہ دل میں بولی۔ نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے، وہ زبان سے بول پڑی۔ ”ٹھیک ہے۔“

☆-----☆-----☆

پہلے پریتی کے دن گزر جاتے تھے۔ اب گزارنے سے بھی نہیں گزرتے تھے۔ اٹھتے بیٹھے سوتے جاگتے وہی یاد آتا تھا۔ اسے بھلانے کے لئے اس نے اپنی ساری قوت ارادی صرف کر ڈالی۔ بھلانے کے دوران اکثر یہ ہوتا تھا کہ کبھی کوئی بولتا تھا تو بچے کا لہجہ یاد آنے لگتا تھا۔ دور کسی اجنبی کو جاتے دیکھ کر پیچھے سے بچے کا گلن ہوتا تھا۔ کبھی ریڈیو یا اخبارات میں کوئی لیڈر تقریر کے دوران چچ کر کہتا کہ شراب پر پابندی ہونا چاہئے تو پریتی دل ہی دل میں اس لیڈر کی مخالفت کرتی۔ کیونکہ اس کا بچے شراب پیتا تھا۔

وہ بچے بعد اچانک بچے نے فون کیا۔ ”ہیلو پریتی! آج تمہیں فرمت ہے؟“

وہ ایک مقدمہ میں ابھی ہوئی تھی۔ بہت مصروف تھی مگر اس نے کہہ دیا۔ ”فرمت ہے۔“

اس رات انہوں نے ایک چائیز ریٹورنٹ میں کھنا کھایا۔ کھانے کے دوران وہ قانون اور سیاست پر گفتگو کرتے رہے۔ دنیا کو پیش آنے والے مسائل کا حل پیش کرتے رہے۔ جبکہ اندر سے اپنا ہی مسئلہ حل طلب تھا۔ وہ بظاہر روحانی گفتگو سے پرہیز کرتے رہے لیکن ابھی اتنا ہی رومانس کافی تھا کہ وہ مل رہے تھے۔

جب وہ گھر واپس آئی تو بہت خوش تھی۔ بستر پر گر کر چاروں شلے چت ہو کر پڑی دیر تک چمت کو کھورتی رہی، اس کی صورت دیکھتی رہی۔ اس کے ساتھ گزرتے ہوئے وقت کو کیسٹ کی طرح دباؤ کر کے اس کی گفتگو کے ایک ایک لفظ کو دوبارہ سنتی رہی، آپ ہی آپ مسکراتی رہی اور شرماتی رہی۔ یہ بھولتی رہی کہ اس سے محبت نہیں کرنا ہے، صرف دوستی کرنا ہے۔ یہ بھولتی رہی کہ دوست کو یاد تو کیا جاتا ہے مگر اس کی یاد سے شرمایا نہیں جاتا۔

ایک ہفتہ بعد دریائے ہنگی کے ساحل پر ان کی ملاقات ہوئی۔ وہاں کشتیوں پر ریٹورنٹ بنے ہوئے تھے۔ وہ ہنگی کی لہروں پر بہتے رہے، کھاتے رہے اور خوب دل کھول کر باتیں کرتے رہے۔ اس بار ان کی باتوں میں رومانس کی چاشنی پیدا ہو گئی تھی۔ پھر ایک ہفتہ بعد بچے نے فون کیا۔ پریتی نے سمجھا، پھر ملاقات کی گھڑیاں نصیب ہونے والی ہیں لیکن اس نے کہا۔ ”پریتی! میں کچھ دنوں کے لئے یورپ جا رہا ہوں۔ تمہارا شہر چھوڑنے کو تھی نہیں چاہتا مگر جانا ہے، ضروری ہے۔“

وہ بولی۔ ”آپ کو ضرور جانا چاہئے۔ میں آپ کا انتظار کرتی رہوں گی۔“

”میں جلد از اپنی پریتی کے پاس پہنچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

وہ خوشی سے لہرا گئی۔ بچے نے پہلی بار اسے اپنی پریتی کہا تھا۔ اتنی سی محاسن جدائی کے دن گزارنے کے لئے کافی تھی لیکن اس کے جانے کے بعد پریتی نے محسوس کیا کہ وہ اس کے لئے بہت فکر مند ہے۔ وہ بیویوں جیسے انداز میں سوچتی تھی کہ پتہ نہیں وہ جہاں گیا ہے، وہاں اس کے کھانے پینے اور سونے کا معقول انتظام ہو گیا یا نہیں؟ سنا ہے یورپ میں شراب اور شاپ دو نوں ہی ملتے ہیں۔ کیا وہ شراب کے ساتھ؟ وہ سوچتے سوچتے ان

تمام لوگوں سے حسد کرنے اور جلنے لگتی تھی، جو تصور میں بھی جلنے کے قریب پائی جاتی تھیں۔

وہ خیال ہی خیال میں بڑھانے لگتی تھی۔ ”تم کب آؤ گے؟ کیا طویل دورے پر گئے ہو؟ کیا تم غیر ممالک کی لڑکیوں کی زبان سمجھ لیتے ہو؟ کیا تم فرطاً کو اپنے ساتھ لے گئے ہو؟ کیا میں باولی ہو گئی ہوں؟“

اس کے معاون کرم چند نے اس کے دفتری کمرے میں قدم پر کھٹے ہوئے پوچھا۔
 ”پریتی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ آپ اپنے ہی آپ کچھ بیڑا رہی تھیں۔“
 پریتی نے دل ہی دل میں کہا۔ ”ہاں میں درد ہوں، دوا چاہئے۔ ٹھنڈے پانی کا غسل
 چاہئے۔ مجھے بخے چاہئے۔“

ماکرم چند سے بولی۔ "میں ٹھیک ہوں" ذرا تھک گئی ہوں تم جاؤ۔"

اس دن سے پریقے نے خود کو بہت زیادہ معروف رکھنا شروع کر دیا۔ وہ اپنی روزانہ پچھری جاتے تھے۔ ایک ہی مقدمہ کی فائل پر زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرنے کے لئے اس مقدمہ پر مختلف پہلوؤں سے خارج سوزی کرنے لگی۔ اگر وہ ایک لمحہ کو بھی ڈھیل دیتی تو وہ لمحہ بچنے کی یاد کو پکڑ کر لے آتا۔

کتنے ہی لمحے کتنے ہی دن اسے قتل کرتے ہوئے گزر گئے۔ پھر ایک دن اچانک فون پر اس کی آواز سنائی دی۔ ”میں آگیا ہوں۔“

بچے کی آواز سنتے ہی جیسے اس کے اندر زلزلہ سا اٹیل ایک دم سے چودا کر کے اس کے بازوؤں میں پھپھنے کے لئے پھل گئی۔ حالانکہ دونوں نے ابھی تک ایک دوسرے کو چھو کر نہیں دیکھا تھا مگر وہ تصور میں دیکھتی تھی۔ اس کے بازوؤں کی تختی میں اپنے بدن کو دکھتا ہوا محسوس کرتی تھی۔ خوشی سے سم کر سوچتی تھی کہ چلنے وہ کیسا ہو گا؟ وہ سوچتی تھی۔ پھر آپ ہی شرما کر منہ چھاپ لیتی تھی۔

پھر ایک ریسٹورنٹ میں ان کی ملاقات ہوئی۔ چند نہیں کہیں وہ ملاقات میں پہلے سے زیادہ اپنا لگتا تھا۔ کھانے کے بعد وہ اسے اپنی کار میں بٹھا کر لے گیا۔ پرستی نے نہیں پوچھا کہ اسے کہاں لے جا رہا ہے؟ وہ تو اس کے سامنے جیسے سحر زدہ سی ہو جاتی تھی۔ دل ہی دل میں اس سے پوچھتی تھی۔ ”میرے جلدوگر! کب تک عمل پڑھتے رہو گے؟ مجھے کہیں

لے جا کر مار کیوں نہیں ڈالتے؟“

رات کے گیارہ بجے اس نے پریق کے کانچ کے سامنے کار لاکر روک دی۔ پھر انجن کو بند کرتے ہوئے کہل: "آج میں تمہارے ہاتھوں کی پٹائی ہوئی جائے گی۔ بھڑکیہ تم مجھے اپنے گھر میں آنے کی اجازت دو۔"

”مسترا کر بولی۔ ”یہ آپ ہی کا گھر ہے۔ آجائے۔“

وہ دونوں کار سے اتر کر کانچ کے دروازے تک آئے۔ پریتی نے اپنے پرس سے جالی نکال کر دروازے کو کھولا۔ اندر تاریکی تھی۔ پریتی نے کہل "میں ایک کمرے کی لائٹ آن کر کے یہاں سے گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے بجلی مچی ہے۔"

اس نے اندر آکر دروازے کے پاس والے سوچے بورڈ کی طرف ہاتھ پھیلیا۔ اس سوچے کو اُن آف کید واقعی بجلی نہیں تھی۔ جبے نے اندر آکر پوچھا۔ ”تکمر میں موم ہی ہوتی؟“

وہ ہماری ہی میں تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے صرف آواز ہی سن سکتے تھے۔ ”موسیقی میری خواب گاہ میں ہے۔“

بولتے وقت اس کی آواز لرز رہی تھی۔ یہ احساس حاوی تھا کہ اندھیرے میں وہ بالکل سانسے کھڑا ہے۔ اس نے پوچھا: ”کیا تم اندھیرے میں اپنی خواب گاہ تک جا سکتی ہو؟“

“**نہایت پروردگار**”

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔ آؤ۔"

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ ہاتھ بدلتا ہے کہیں لگ گیا۔ ایک دم سے بجلی دوڑ گئی۔ یہاں سے وہاں تک دنیا روشن ہو گئی۔ عجیب روشنی تھی کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور اپنے غبے کے سوا کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اندھیرے میں بڑھتے رہے اور رکے رہے۔ بولتے رہے اور بولنے والے لیوں کو گپ چپ کرتے رہے۔ خواب گاہ میں پہنچنے کے بعد موسم غنی نہیں ملی۔ یاد نہیں آیا کہ اس نے کہاں رکھ دی تھی۔ خوب سازش تھی کہ صبح تک بجلی بھی نہیں آئی۔

وہ صبح ان کے لئے قیامت بن گئی۔ کیونکہ اب وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہونا چاہتے تھے لیکن انہوں نے تو بددلی سنے دہلی محبت کی تھی۔ انہیں نہ چاہئے کہ باوجود الگ ہونا تھا۔ وہ جسے محبت کہتے تھے 'اسے تہذیب گناہ کہتی تھی۔ ایسی محبت صرف نادان نہیں کرتے' ان کے جیسے باشعور بھی کرتے ہیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم نے ایسی سرستیں دی ہیں کہ مجھے پہلی بار عورت اور اس کی محبت سمجھ میں آ رہی ہے۔"

وہ شرمائی۔ نظریں جھکا کر بولی۔ "عورت تو آپ کے گھر میں بھی ہے۔"

"ہاں۔ آج مجھے پتہ چلا ہے کہ میں نرملہ سے صرف فرض نبھاتا آیا ہوں۔ میری جان! ہم حلیم یافتہ ہیں۔ اپنے جذبات و احساسات کو نقصان میں بیان کر سکتے ہیں تم بتاؤ کہ تمہارے احساسات کیا ہیں؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "میرے اندر ایسی سرستیں بھری ہوئی ہیں کہ انہیں بیان کرتے کرتے الفاظ کے خزانے خالی ہو جائیں گے۔ بھگوان سے میری ایک ہی خواہش ہے کہ یہ وقت جو مجھے مل رہا ہے، وہ ملتا رہے۔ آپ کو پانے کا یہ سلسلہ میری موت کے ساتھ ختم ہو۔"

وہ پیار بھری باتوں سے سرشار ہو کر پھر ایک دوسرے کو پانے کا یقین کرنے لگے۔ ان کے درمیان وقت اندھی ہوا کی طرح گزر رہا تھا۔ پھر بجے نے کھڑکی کے باہر صبح کی پہلی جھلک دیکھ کر کہا۔ "مجھے فوراً یہاں سے جانا چاہئے۔ میری کار باہر کھڑی ہے۔ کسی نے پہچان لیا تو ہمارا یہ ملاپ اخبارات تک پہنچا جائے گا۔"

پریتی کے دل سے ایک آہ نکل۔ "آہ! کیسے مرد کے آگے تن من ہار بیٹھی ہوں۔ اس کی شہرت شیشے کی طرح نازک ہے۔ اس کے ساتھ میرا نام آتے ہی یہ پتھر پتھر ہو جائے گا۔"

بجے نے جھک کر اسے چھپکتے ہوئے کہا۔ "تم اداس ہو گئیں، نہیں میری جان! ہمارے ملنے رہنے کی ایک تدبیر میرے ذہن میں ہے۔"

"کیا تدبیر ہے؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم ابھی دس بجے تک تیار ہو کر کل رینورنٹ پنچو ہم وہاں سے ایک بھگہ کرائے پر حاصل کرنے کے لئے نکلیں گے ایسا بھگہ جس میں موٹر گیراج ہو گا وہاں میں اپنی کار چھپا

دیا کروں گا۔ تم وہاں رہو گی میں رات کو آیا کروں گا اور صبح جایا کروں گا۔"

"اور تمہاری دھرم جتنی نرملہ دیوی؟"

"میں نے اسے دو ماہ کے لئے دہلی بھیج دیا ہے۔ وہ وہاں اپنے رشتے داروں کے ہاں رہے گی۔ میں رفتہ رفتہ اسے قائل کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ جلد ہی طلاق لے لے گی۔"

پریتی کا سر جھک گیا۔ ایک سوال پیدا ہوا کیا بجے اس کی خاطر نرملہ کو طلاق دے گا؟ ایک جواب ملا۔ نہیں۔ وہ اولاد کے لئے ایسا کرے گا۔ اگر میں اس کی زندگی میں نہ رہوں تب بھی وہ اولاد کے لئے کسی نہ کسی سے شادی ضرور کرے گا۔ نرملہ کی بد نصیبی سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔

پریتی نے اپنے ضمیر کو سمجھایا اور اس دنیا میں کون اپنے ضمیر کو اتلو نہیں جاتا؟

☆-----☆-----☆

دو بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ ڈائننگ روم کا بھگہ بہت خوب صورت تھا۔ دولت ہو تو دنیا کی ہر خوبصورتی کو داشتہ بنا کر رکھا جاسکتا ہے۔ بجے کرنی نے قیمتی فرنیچر اور دوسری ضروریات کا سامان خریدا تھا اور پریتی نے اس گھر کو بوڑے سیلفے سے سجایا تھا۔ بڑی تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ کہ وہ گھر پیشہ بجے کے دم قدم سے آباد رہے۔

بجے نے اپنے دو چار جوڑے وہاں لا کر رکھے تھے کیونکہ وہ ہر رات وہاں گزارتا تھا اور وہاں سے لباس بدل کر واپس جاتا تھا۔ پریتی نے دکان کے پیشے میں رہ کر پہلے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ گھریلو عورت بنے گی مگر اب وہ اپنے مرد کی ایک ایک پسند کا خیال رکھتی تھی۔ اس کے لئے کھانا پکاتی تھی۔ اس کے کپڑے دھوئی اور استری کرتی تھی۔ رات کو جب وہ سو جاتا تو وہ اسے ہانوں میں لے کر جاگتی رہتی اسے دیکھتی رہتی۔ دماغ کے کسی گوشہ میں یہ خوف تھا کہ تقدیر کبھی اسے چھین بھی سکتی ہے۔ اس لئے اسے ہی بھر کر دیکھتے رہنے کی جتنی گھڑیاں میرا آئی تھیں، وہ دیکھتی رہتی تھی اور اس وقت تک آنکھیں کھلی رکھتی تھی جب تک کہ نیند زبردستی اس پر غالب نہ آجائی۔ وہ سارے اندیشے بھول کر اس کی پناہ میں سو جاتی تھی۔

دو آگلی ایسی تھی کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے الگ نہیں رہنا چاہتی تھی۔

حیثیت سے نامزد ہو چکا ہے۔ اس کی تعریف کی محی محی کہ اس نے بنگل جیسے زرعی صوبہ میں صنعتی ترقی کے لئے بہت اہم رول ادا کئے ہیں۔ اس کی سماجی خدمت کو بھی بہت سراہا گیا تھا۔ پرتی نے اس سے ٹیلی فون پر کہہ "میں پیش گوئی کرتی ہوں کہ آپ عوام کے منتخب نمائندہ ہوں گے۔ کامیابی آپ کی منتظر ہے۔"

"شکریہ۔ میں ابھی تمہیں اس مقدمہ کی کامیابی پر مبارکباد دینا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے تم نے ہی مجھے فون کر لیا۔ بہر حال بنگلے میں سات بجے کچھ کر پڑے پیار سے مبارکباد دوں گا۔"

اچانک پرتی کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کے دماغ کے کسی گوشہ میں ایک ایڈیشن کھلیا رہا تھا جسے وہ اس وقت اچھی طرح نہ سمجھ سکی۔ رات کو بنگلے کے بازوؤں میں چھپنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ اندیشہ کیا ہے؟ وہ چاہتی تھی کہ اس کا بنگلے دونوں کی بھاری اکثریت سے جیت جائے لیکن ہار جیت کی وہ تگوار اس محبوبہ کے سر پر ٹک رہی تھی۔ اگر بنگلے جیت کا انتخاب جیتے گا تو وہ محبت کی بازی ہار جائے گی۔ کیونکہ..... سیاست میں عشق اور انکینڈل کے لئے گنجائش نہیں رہتی۔ وہ شادی شدہ تھا اگر یہ بھید کھل جائے کہ اس نے ایک داشتہ رکھی ہے تو یہ بنگلے کے لئے سیاسی خود کشی ہوگی۔

اس نے ایک سرو آہ بھری۔ بنگلے نے پوچھا "کیا بات ہے؟" وہ بول۔ "اب اور زیادہ آپ کو غلط رہنا ہو گا۔ مخالف امیدواروں کو ہمارے تعلقات کا علم ہو گا تو وہ اطلاعات کا ڈھنڈورا پیٹ کر آپ کو عوام کی نظروں سے گمراہ کھائیں گے۔"

"پرتی! یہ سچ ہے کہ عشق اور محبت چھپائے نہیں چھپتے۔ نرماداپس آگئی ہے اور اسے ہمارے تعلقات کا علم ہو گیا ہے۔"

اس نے چونک کر پوچھا "کیسے؟" "چہ نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ گھر کی کسی نوکرانی نے اسے بتا دیا ہے کہ میں راتیں گھر میں نہیں گزارتا تھا۔"

"پھر تو بیوی نے خوب جھگڑا کیا ہو گا؟" "تم نرماد کو نہیں جانتیں وہ بالکل گائے ہے۔ اسے..... غصہ نہیں آتا۔"

دن کو جب وہ نہیں ہوتا تھا تو پرتی بنگلے کے اندر اس کی فیض بہن کر پھرتی تھی۔ صبح وہ بستر سے اٹھ کر جاتا تو وہ کدو بدل کر اس کی خالی جگہ پہنچ جاتی تھی۔ اس جگہ وہ بنگلے کی گرم گرم محبت محسوس کرتی تھی۔ والہانہ لگاؤ ایسی تھی کہ اس کے کپڑے بہن کر پرتی کو سکون ملتا تھا۔ ریڈیو سے نشر ہونے والے فلمی اور غیر فلمی محبت بھرے گیت یوں لگتے تھے جیسے وہ سب اس کے اور بنگلے کے لئے گائے جا رہے ہوں۔

اسے ہوش نہیں تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے اور وہ ہوش میں رہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار عہد ہوشی کا چسکا پڑا تھا۔ ہاں مگر کدو کے پٹے میں وہ جاتی وجود نہ رہتی تھی۔ خود کو بنگلے کے شایان شان بنانے کے لئے اہم مقدمات پر خصوصی توجہ دیتی تھی۔ اس کا نام اور اس کے کارنامے بھی اخبارات میں شائع ہونے لگے تھے۔

وہ بنگلے کے شانہ بشانہ رہنے کے لئے اپنی جلن کی بازی بھی لگا سکتی تھی۔ وہ سب کچھ کر سکتی تھی لیکن اس کے ساتھ پبلک مقامات پر گھوم نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ بنگلے سے روح کی گمراہیوں تک رشتہ ہونے کے باوجود اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ بلکہ ایک گالی تھی جو دونوں کے درمیان محبت سے جاری تھی۔

بس یہی سوچ کر اس کے دل پر چوٹ لگتی تھی۔ کیا بیوی کا رشتہ سب کچھ ہوتا ہے۔ محبوبہ کچھ نہیں ہوتی؟ حالانکہ وہ بیوی سے زیادہ اپنے مرد پر اعتماد کرتی ہے۔ کسی تحریر، کسی طہنت کے بغیر اپنی عزت، اپنا غرور اور اپنا مستقبل اس مرد کے حوالے کر دیتی ہے اور دوسرے نکاح نامہ کے باوجود میاں بیوی ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے۔ پوری سوسائٹی کی طہانت حاصل ہونے کے باوجود کبھی میاں بیوی کو اور کبھی بیوی میاں کو چھوڑ دیتے ہیں یا قتل کر دیتے ہیں۔ پھر بھی وہ مذہب ہوتے ہیں اور محبت کا رشتہ مخالف تہذیب کچھ لیا جاتا ہے۔

ایک صبح دونوں کا نام اخبارات کے پہلے صفحہ پر شائع ہوا۔ پرتی ہلانے پھر ایک بار ایک پیچیدہ مقدمہ سے گزرتے ہوئے اپنی ایک ایسی متوکہ کو سزائے موت سے بچالیا تھا جس نے اپنے شوہر کی بے راہ روی سے تنگ آکر اسے قتل کر دیا تھا۔ اس کاظم کو قانون کے قہر سے بچانا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اسی لئے پرتی ہلا کا چہرہ اخبار میں تھا۔ دوسرا نام بنگلے کے حلقہ خیر شائع ہوئی تھی کہ وہ آئندہ انتخابات میں امیدوار کی

”تجربہ ہے۔ میں اس کے شوہر سے ملتی ہوں۔ کیا مجھ پر بھی غصہ نہیں آیا؟“۔۔۔
”کیوں آئے گا؟ ہمارے درمیان طلاق ہونے والی ہے۔ اس کے بعد میری زندگی میں کوئی بھی آئے۔“

”کیا طلاق کے لئے بات آگے بڑھی؟“

”ابھی نہیں۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔“

”کون؟ نرملہ؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ ابھی تمہیں ساتھ لاؤں گا۔“

”مگر کیوں؟ میرا اس سے ملنا کیا ضروری ہے؟“

”بس اس کی خواہش ہے۔ پریتی! اس سے مل کر تمہیں معلوم ہوگا وہ اتنی اچھی

ہے کہ میں اس کی کوئی بات نہیں سنا۔“

”مگر مجھے اس کے سامنے جاتے ہوئے اچھا نہیں لگے گا۔ میں اس کے سامنے چور

بن جاؤں گی۔ کیونکہ۔ کیونکہ میں آپ کو اس سے چراتی ہوں۔“

”یہ تمہارے فضول خیالات ہیں۔ میں برائے نام اس کا شوہر ہوں۔ تم نے اس کا

حق نہیں مارا ہے۔ چلو تیار ہو جاؤ۔“

”نہیں۔ مجھے ذرا سوچنے دیجئے۔“

”سوچنا کیا ہے؟ میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔“

وہ ہنسی بولتی ہوئی۔ ”میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟ وہ بات یہ ہے کہ ہم دونوں

عورتیں یعنی کہ میں اور وہ اور آپ کی تعالیٰ میں رہتی ہیں۔ آپ کی موجودگی میں

مجھے اس کا سامنا کرتے ہوئے شرم آئے گی۔“

اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”او آئی س۔ اچھا تو ایسا کرتے ہیں کہ میں

تمہیں اپنی کوٹھی کے سامنے چھوڑ کر کہیں وقت گزارنے چلا جاؤں گا۔ تم تھا جا کر نرملہ سے

ملاقات کرنا۔“

وہ لباس بدلنے چلی گئی۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ اس نے..... سوچا بھی نہیں تھا

کہ کبھی نرملہ سے سامنا ہوگا اور اب سامنا ہوگا تو وہ کیسے نظریں ملائے گی؟ رداگلی کے

وقت بچے کے ساتھ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھتے وقت پہلی بار احساس ہوا کہ اسے اس عرصے کے

ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھنے کا حق نہیں ہے۔ نرملہ نے اگر یوں بیٹھے دیکھ لیا تو اس پر ہنسے گی۔

بچے نے ایک دکان کے پاس گاڑی روک کر وہاں سے فون پر نرملہ کو اطلاع دی کہ

وہ پریتی کو کوٹھی کے سامنے چھوڑ کر کہیں تھوڑا وقت گزارنے جائے گا کیونکہ پریتی اس

سے تعالیٰ میں ملنا چاہتی ہے۔ اسے اطلاع دینے کے بعد وہ پھر کار میں آگیا۔ اس نے پریتی

کو بھی بتا دیا کہ کوٹھی کے دروازے پر نرملہ اس کا استقبال کرے گی۔

واقعی نرملہ دروازے پر منتظر تھی۔ دور احاطہ کے باہر بچے پریتی کو چھوڑ کر چلا گیا۔

پریتی احاطہ کے گیٹ سے داخل ہو کر دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ اوپر سے نرملہ بڑھتی

ہوئی آئی۔ قریب پہنچتے پہنچتے اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بڑے غلوں سے فیسے کھل۔ نرملہ

کے اس پیار بھرے انداز نے پریتی کی دھڑکن بند کر دی۔ اس نے دوسرا منہ ہو کر اسے

بڑے غصے کی بیوی ہو کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے فیسے کھاتے۔ یہ عادت ہو گئی

تھا کہ نرملہ نہ تو مغرور ہے اور نہ ہی اسے سوکھ سمجھ کر کوئی طریقہ انداز اختیار کرنے والی

ہے۔

اس نے ملل کی ایک معمولی سی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ سنجیدہ

معاہدہ فہم اور بھاری بھرکم شخصیت والی عورت لگ رہی تھی۔ کوٹھی کے اندرونی کمرے

کی سجاوٹ سے بھی نرملہ کی خوش ذوقی اور سلیقے کا پتہ چلتا تھا۔ ملاقات کی ابتدا میں پریتی

نے مان لیا کہ وہ عورت دل میں گھر کھیتی ہے۔ تجربہ ہے کہ بچے اس گھر سے کیسے نکل

گیا؟

☆-----☆-----☆

وہ ڈانٹنگ روم میں آئے۔ پریتی نے بہانہ کیا کہ اسے بھوک نہیں لگ رہی ہے۔

نرملہ نے کہا۔ ”تم ہیر سٹر ہو۔ تمہیں تو کھانے پینے میں بھی وقت کی پابندی کرنا چاہیے۔

نہیں کہہ گی تو شادی کے بعد بچے کو بھی وقت پر کھانا نہیں دے سکو گی۔“

پریتی بے حد متاثر ہوئی۔ وہ بیوی ہو کر اپنے شوہر کو ابھی سے اس سے منسوب کر

رہی تھی۔ دونوں کھانے کی میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ جب ملازم کھانا لگا کر چلے گئے تو نرملہ

نے پوچھا۔ ”تم ان سے بہت پیار کرتی ہو۔ ہے نا؟“

پریتی نے ہنسی بولتی ہوئی کہا۔ ”میں کیا کہوں۔ میں اپنے بس میں نہیں تھی۔ یہ دل

بڑا پانی ہوتا ہے۔ پتہ نہیں میں کیسے ان کی طرف مائل ہو سکی اور اب میری یہ حالت ہے کہ حرکت ہی انہیں شاید بھلا سکتی ہوں۔“

”میں تمہیں الزام نہیں دے رہی ہوں۔ زندگی کے بہت سے معاملات ہمارے ہمارے بس میں نہیں ہوتے۔ مثلاً میری ازدواجی زندگی میرے بس میں نہیں رہی۔ مجھے سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ اس پیار کے پیچھے محض ایک بھڑکی ہے جو ایک بانجھ عورت سے کی جاتی ہے۔ اگر ہمارے ہاں صرف ایک بچہ ہو جائے تو ان کے پیار کی سچائی لوٹ آئے گی۔“

نرملہ کو اپنے آپ پر مکمل احاطہ تھا۔ وہ بد صورت نہیں، خوب صورت تھی۔ چھوڑ نہیں سکتی عورت تھی۔ صحت کے اعتبار سے بھرپور اور پُرکشش تھی۔ کوئی مرد اسے پا کر چھوڑنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ پریتی یقین سے کہہ سکتی تھی کہ مجھے نرملہ کو دل و جان سے چاہتا ہے۔ صرف ایک اولاد کی کمی عورت کے حسن اور صلاحیتوں کو اور اس سے ہونے والی چاہت کو خاک میں ملا دیتی ہے۔

نرملہ نے درود بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں ان سے برابر کہتی رہی کہ مجھے چھوڑ دیں۔ دوسری شادی کر لیں لیکن وہ ہمیشہ پس پیش میں رہے۔ شاید مجھے چھوڑنے کے لئے غیر ان کا ساتھ نہیں دیتا تھا۔ شاید انہیں اب تک اپنی پسند اور معیار کی لڑکی نہیں ملی تھی۔ میں نے تمہارا ذکر سنا تو دیکھنے کو دل چاہا۔ پریتی! تم بچے خند رہو۔ مجھے کے شایان شان تم میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ تم عورت بھی ہو اور مرد بھی۔ بڑی بڑی عداوتوں میں بڑے بڑے بد مشوروں کو منہ توڑ جواب دیتی ہو۔ مجھے کی طرح اخبارات میں تمہارا نام بھی شائع ہوتا رہتا ہے تم دونوں کی جوڑی بے مثل ہے لیکن میں تمہیں نیک مشورہ دوں گی کہ شادی سے پہلے طبی معائنہ کرا لیتے۔ جگوان کرے کہ تمہارے سارے بچے پورے ہوں لیکن اگر تم بھی بانجھ نکلیں تو پھر دوسری نرملہ بن جاؤ گی۔ تمہاری ساری خوبیاں اور سندرتا خاک میں مل جائیں گی۔“

نرملہ نے بڑی بڑی زہریلی بات کہی تھی۔ یہ بات پریتی کے دل کو لگی۔ مگر دل پھر بھی یہ ماننے کے لئے تیار نہ ہوا کہ اس سے بھی اولاد نہ ہوئی تو مجھے اسے بھی ایک دن چھوڑنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ پریتی نے نرملہ سے پوچھا۔ ”کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ

وہ انسانوں کے درمیان کبھی بے لوث محبت نہیں ہوتی۔ محبت بچے پیچھے کوئی فرض ہوتی ہے۔ وہ فرض پوری نہ ہو تو محبت میں فرق آجاتا ہے۔“

”مجھ پر یہی گزر رہی ہے۔ اس لئے میں یہی کہہ رہی ہوں۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بچے بے وفا اور ہرجائی ہے۔ نہیں۔ وہ تمہیں بانجھ ہونے کے باوجود چاہتے رہیں گے لیکن وہ چاہت ایک فرض کے طور پر ہوگی۔ وہ محبوب نہیں، بھڑکی ہوں گے۔ ایک دہائی ہوں گے ہمارے تمہارے آنسو پونچھنے کے لئے۔“

تھوڑی دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ پریتی لقمہ چباتے ہوئے سوچتی رہی۔ پھر نرملہ نے کہا۔ ”میری باتوں سے یہ تاثر نہ لینا کہ میں تمہیں مجھے کے خلاف ہکا رہی ہوں۔ فرض کرو اگر میں تمہیں ہکا کر بیٹھے کے راستے سے ہٹا دوں تو کوئی دوسری آجائے گی۔ وہ تو اولاد کے لئے ضرور دوسری شادی کریں گے۔ کسی سے بھی کریں گے۔“

”نرملہ دیوی! آپ کی باتوں میں سنجیدگی اور سچائی ہے۔ میں آپ کے غلوں پر شبہ نہیں کر رہی ہوں۔ سوچ رہی ہوں کہ آپ نے مجھے کو چھوڑنے کے لئے دل کو کیسے مضبوط بنا رکھا ہے۔“

وہ ایک سرد آواز بھر کر بولی۔ ”میں اوپر سے مضبوط ہوں۔ اندر سے بہت کمزور ہوں۔ جیسے ہر عورت محبت میں ہوتی ہے۔ میں دن رات سوچتی رہتی ہوں کہ مجھے کی دھرم پتی بنے رہنے کا کوئی بہانہ مل جائے۔ کبھی میری پوجا قبول ہو، ایسا کرشمہ ہو کہ میں اچانک مل جائے لگوں اور یہ ممکن نہ ہو تو قانون اور دھرم مجھے بچنے کے قدموں میں رہنے کی اجازت دے دے۔ میں عجیب الٹی سیدھی باتیں سوچتی ہوں۔ کبھی سوچتی ہوں۔ لاش ہم مسلمان ہوتے۔“

پریتی نے اسے چونک کر دیکھا۔ وہ سر جھکا کر بولی۔ ”ہاں میں مجھے کے لئے دھرم بدل سکتی ہوں۔ اسلام میں یہ پھلت ہے کہ بیوی بانجھ ہو تو اسے طلاق دینا ضروری نہیں ہوتا۔ نرملہ دوسری شادی کر سکتا ہے اور بانجھ عورت کو اپنی توہین کا احساس نہیں ہوتا کہ اسے بیکار اور غبر سمجھ کر ٹھکرا دیا گیا ہے۔ ایک زمانہ کہتا ہے کہ عورت اپنی سوکن کو برداشت نہیں کرتی۔ زندگی کے اس موڑ پر اگر میں تمہیں برداشت کر رہی ہوں۔ تم بھی مجھے کی خاطر مجھے برداشت کر سکو گی مگر یہ میری پاگل سوچیں ہیں۔ نہ ہم مسلمان ہیں نہ

ایک مرد کی دو بیویاں بن کر رہ سکتے ہیں۔“

پرتی نے سر ہلا کر کہہ ”زندگی کے ایسے موڑ پر ایسا ہی مذہب سب سے افضل ہوتا ہے جو محبت کا تحفظ کر سکے لیکن بچے کے لئے محبت سے زیادہ سیاست اہم ہے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ وہ سیاست میں رہ کر آپ کی خاطر اسلام قبول کر سکتے ہیں؟“

نرملہ نے جواب دیا۔ ”مجھے یہ خوش قسمی ہے کہ مجھے میرے لئے سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن انہوں نے مذہب بدلا تو انہیں ایک دوت بھی نہیں ملے گا۔ مجھے خلاق ملے کر اس گھر سے جانا ہی پڑے گا۔“

پرتی نے کن انکھوں سے اسے دیکھا۔ بے شک ہندو دھرم میں طلاق کے بغیر کام نہیں چلتا۔ پہلی بیوی کو اپنی زندگی سے نکالنے کے بعد ہی اولاد کے لئے دوسری شادی کی جاسکتی ہے اور اب نرملہ کے طلاق لینے کا وقت آگیا تھا۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ ”میں بچے کی خوشی چاہتی ہوں۔ اسے باپ بننے دیکھنا چاہتی ہوں۔ میرے بس میں ہوتا تو میں آج ہی گھر چھوڑ کر چلی جاتی لیکن میں جلدی گی تو بچے انکیشن ہار جائیں گے۔“

پرتی کو نرملہ کی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ دوسرے ہی لمحہ نرملہ نے سمجھاتے ہوئے کہہ ”طلاق دینا ایک جالاندہ فعل ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ بیوی کے پاس پندرہ برس کی وفاداری اور سلیقہ مندی کا ریکارڈ ہو اور ہاتھ ہونے میں اس کا اپنا کوئی قصور نہ ہو میں انتخاب سے پہلے طلاق لوں گی تو یہ خبر اخبارات میں آئے گی۔ مخالف امیدوار میری مظلومیت کو اس قدر اچھالیں گے کہ بچے عوام کی نظروں سے گر جائیں گے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

وہ بالکل درست کہہ رہی تھی۔ پرتی اب تک رومانی جذبات میں گھری ہوئی تھی۔ اس نے نرملہ کے نقطہ نظر سے نہیں سوچا تھا۔ اب بات سمجھ میں آئی تو اس نے تسلیم کیا کہ ابھی نرملہ کو طلاق دینا بچے کے لئے منگا پڑے گا۔ لہذا ابھی صبر کرنا ہو گا۔ انکیشن کے لئے صرف چھ ماہ رہ گئے تھے۔ ابھی نہ سسی چھ ماہ بعد اسے بچے کی دلمن بننا ہی تھا۔ انتخابات میں کامیابی یقینی تھی۔ سینیٹر منتخب ہونے کے بعد بچے نے کہا تھا کہ وہ اسے دھرم دیتی بنا کر وہاں کی راجہ حالی دلی لے جائے گا۔ سرکاری طور پر وہیں رہائش اختیار کی جائے گی۔

وہ رات کے ساڑھے بارہ بجے اپنے بچلے میں واپس آئی۔ وہاں بچے اس کا انتظار تھا۔ اس نے پرتی کے قریب آکر پوچھا۔ ”نرملہ سے ملاقات کیسی رہی؟“

”بہت اچھی رہی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس قدر منتشر اور محالہ فہم ہوگی۔ وہ آپ کو لاؤ لے دیکھنا نہیں چاہتی۔“

وہ دور کہیں دیکھنے لگا۔ پرتی کو آغوش میں لے کر جیسے اپنے سامنے نرملہ کو فریادی کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ پھر آہستگی سے بولا۔ ”وہ ہر حال میں میری بھلائی چاہتی ہے۔ کتنی ہے انکیشن سے پہلے طلاق لے گی تو مجھے نقصان پہنچے گا۔ وہ بڑی عقل مند اور ذہین ہے۔“

”آج نرملہ کی باتوں سے معلوم ہوا کہ آپ اسے دل دہان سے چاہتے ہیں۔ آپ اس کی کوئی بات نہیں ٹالتے۔ ایک بات سچ بتائیں۔ کیا آپ اسے مجھ سے زیادہ چاہتے ہیں؟“

”پرتی! محبت کو تپا اور تولا نہیں جاسکتا۔ نرملہ کی سوچ کے مطابق اگر میں مسلمان ہوتا اور تم دونوں میرے پاس بیویوں کی حیثیت سے رہ سکتیں تو میں دونوں سے برابر محبت اور انصاف کرتا۔ اپنے موجودہ حالات میں یقین آجاتا ہے کہ دو بیویاں رکھنے والا شخص کیسے دونوں سے انصاف نہ کرے گا؟ اس لئے کہ محبت نہا کر آتی ہے۔ میں تم دونوں سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ تم میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتا۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”آپ نرملہ کے انداز میں سوچ رہے ہیں؟ کیا آپ اس کی خاطر اپنا دھرم چھوڑ سکتے ہیں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”صرف نرملہ کا نام لے کر نہ پوچھو۔ میں تم دونوں کی محبت کی خاطر دین دایمان سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ محبت ذات پات دین دھرم نہیں دیکھتی لیکن ہم سیاست دان اور قانون دان ہیں۔ ہم ایسی شہرت حاصل کرتے ہیں کہ گناہ لوگوں کی طرح اپنے ارادے اور اپنا دھرم نہیں بدل سکتے۔ اس موضوع پر گفتگو کرنا فضول ہے۔“

انہوں نے موضوع بدل دیا۔ جذبوں کی زبان سے باتیں کرنے لگے۔ انہیں ایک دوسرے کا جیون ساتھی بننے کے لئے چھ ماہ گزارنے تھے۔ وہ مینے گزارنے لگے۔ بچے کی مصروفیات اتنی بڑھ گئیں کہ وہ پرتی کے ساتھ بڑی مشکلوں سے ہفتہ میں ایک رات گزارتا

”نرمل! میں نے اکثر یہی سوچا ہے کہ ابھی جس طرح معاملہ چل رہا ہے، چلتا رہے لیکن اولاد کا کیا ہوگا؟“

”میں ایک آخری کوشش کروں گی۔“

”وہ کوشش کیا ہوگی؟“

”میں بتا دوں گی۔ آپ میری کسی بات سے انکار نہیں کرتے ہیں۔ کیا آپ میرے کہنے پر ایک دو دن کے لئے انتخابی مہم کی سرگرمیاں بند کر سکتے ہیں؟“

”میری جان! میں تمہارے کہنے پر انکیشن لڑنے سے باز آسکتا ہوں۔ پولو کیا چاہتی ہو؟“

”ہم دہلی آگئے ہیں۔ اجیر میاں سے دور نہیں ہے۔ آپ ایک دن کے لئے میرے ساتھ وہاں چلیں۔“

”وہاں جا کر کیا ہوگا؟“

”میں خواجہ بابا سے پرار تھا کروں گی۔ بس ایک بچہ مانگوں گی۔ سینکڑوں سال سے سب مانتے ہیں کہ ان کے دربار سے کوئی سوائی خلی نہیں جاتا۔“

”نرمل! یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دولت مانگنے والوں کو کہیں راستے میں روپے سے بھری قہلی مل جائے لیکن بچہ مانگنے والی ہاتھ کے پیٹ میں بچہ کہاں سے آسکتا ہے؟ تم تعلیم یافتہ اور ذہین ہو۔ جاہل عورتوں جیسا عقیدہ کیوں رکھتی ہو؟“

”عقیدہ رکھا نہیں جاتا۔ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ جاہل انسان کی تمام شعوری کوششیں تھک ہار کر ناکام ہو جاتی ہیں۔ وہاں وہ تمام عقلی دلائل کو بھول کر کسی ان دیکھی انداز پر بھروسہ کرتا ہے۔ میں بھی خواجہ بابا پر بھروسہ کرتی ہوں۔“

”خجے اس کے عقیدے کو نہیں نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اجیر تک جانے کے لئے راضی ہو گیا۔ اس نے اپنی مصروفیات میں سے ایک دن نرمل کے لئے وقف کیا۔ اسی رات وہ دونوں ٹرین کے اریجے اجیر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے لئے فرسٹ کلاس کا ایک کمپارٹمنٹ ریزرو تھا۔ جدھر ٹرین جا رہی تھی، ادھر اجیر تھا۔ نرمل ادھر نہ گئے فرش پر پاتھی مار کر بیٹھ گئی تھی اور اجیر کی سمت دونوں ہاتھ جوڑ کر خاموشی سے رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کے آنسو دعا کی طرح بہہ رہے تھے۔“

تھک ریڈیو سے اس کی تقریریں نشر ہوتی تھیں۔ ٹی وی کے اسکرین پر وہ اکثر کسی نہ کسی تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے نظر آتا تھا۔ خبر آتی تھی کہ وہ صبح دہلی میں ہے شام کو بمبئی پہنچ گیا ہے۔ کبھی مدراس، کبھی مدھیہ پردیش، کبھی اتر پردیش، کبھی بہار، اڑیسہ اور کبھی مشرقی بنگال اور راجستھان۔ وہ روز اپنی پارٹی کے سیاسی جلسوں میں تقریریں کرتا تھا مگر ایک بات ہے۔ وہ بھارت کے جس گوشے میں بھی جاتا تھا وہاں سے ٹرک کھل پر پرچی سے ضرور باتیں کرتا تھا۔ اس کی باتوں کا لب لباب یہ ہوتا تھا کہ اپنی پرچی کے بغیر خود کو خالی خالی عبوس کرتا ہے۔ ایک بار اسے پتہ چلا کہ انتخابی مہم کے دوران نرمل اس کے ساتھ دہلی گئی ہے۔ اس سے پرچی کے دل میں یہ شدید آرزو پیدا ہوئی کہ کاش وہ اس وقت اس کی بیوی ہوتی اور اعلیٰ اس کے ساتھ انتخابی مہم میں حصہ لیتی۔ اے کاش!

☆-----☆-----☆

وہ انتخابی مہم کے دوران جس شہر میں پہنچتا تھا وہاں اس کا شاندار استقبال ہوتا تھا۔ وہاں کے بڑے بڑے سرمایہ دار اس کی بہترین رہائش کا انتظام کرتے تھے۔ دہلی پہنچ کر نرمل نے پوچھا۔ ”آپ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں پھر طلاق کے بعد میرے بغیر کیسے رہ سکیں گے۔“

”مجھ میں نہیں آتا کیسے رہوں گا۔ یوں تو پرچی سے بہت عار ملے گا۔ شاید وہ میرے بچے کی ماں بھی بن جائے۔ وہ میرا دل اور میرا گھر بیت لے گی لیکن میں تمہیں ہار جاؤں گا۔ تم چھڑنے کے بعد اور یاد آؤ گی۔“

”میں دن رات اس مسئلہ پر سوچتی رہتی ہوں۔ ایک ہی بات مجھ میں آتی ہے کہ پرچی آپ کی محبوبہ ہے۔ اسے جب تک بیوی کا درجہ نہ ملے۔ وہ محبوبہ کے طور پر ہی مطمئن رہے گی۔ مجھے بیوی کا غرور اور سماں کا باعزت سلانی رشتہ مل چکا ہے۔ میں اس رشتے سے گر کر آپ کی داشتہ بن کر نہیں رہ سکتی گی۔“

پھر بات کیا سمجھ میں آئی؟

”میں کہ مجھے اور پرچی کو اپنے اپنے ہی مقام پر رہنا چاہئے“ اسی طرح آپ دونوں سے اپنی محبت اور جائز اور ناجائز رشتوں کو بحال رکھ سکتے ہیں۔ ایسا کوئی بیوی نہیں کے گی۔ یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ پرچی کو ہر حال میں برداشت کروں گی۔“

بچے کو بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ دعا بچے کے لئے ہے مگر وہ اپنے مرد کے لئے ہے۔ اس بھڑی کو آنے والے بدوائی کے دن ابھی سے کھائے جا رہے تھے۔ کیا ضروری ہے کہ دعا قبول ہو؟ بچے آگے بڑھ کر صرف اتنا کہہ دے۔ ”نرملہ دنیا میں کتنے ہی لوگ بغیر اولاد کے جی لیتے ہیں۔ مجھے بچہ نہیں چاہئے۔ ایک بچے کے ہمارے پریت نہیں چاہئے۔ میں صرف تمہیں چاہتا ہوں۔“

لیکن وہ ایسا نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایسا کہنے کا وقت گزر چکا تھا۔ کیونکہ وہ نرملہ کی طرح پریت کو بھی محبت کا روگ لگا چکا تھا۔ اگر چھوڑنے کی بات ہوتی تو اس محبوب کے آنسو اور شکوے کے سامنے بھی وہ ندامت محسوس کرتا اسے کسی طرف قرار نہیں تھا۔ وہ کمپارٹمنٹ کے ایک برتھ پر منہ ڈھانپ کر سو گیا۔

دوسری صبح نرملہ نے اسے بگایا۔ ”اٹھ جاؤ۔ ہماری منزل قریب آ رہی ہے۔“ وہ اٹھ کر ہاتھ روم میں چلا گیا۔ اسٹان کرنے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا۔ نرملہ نے ملازم سے کہا وہ سالن لے کر اجیر کے ایک ہوٹل میں جائے۔ وہ اپنے بچے کے ساتھ بعد میں آئے گی بچے نے پوچھا۔ ”ہم بعد میں کیوں جائیں گے اور ابھی ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

اسنے میں گاڑی ایک اسٹیشن پر ٹھہر گئی۔ نرملہ نے بچے سے کہا۔ ”اب آپ جوتے پہنیں۔ چھوڑ کر گاڑی سے اتر جائیں۔“

”یعنی کہ ننگے پاؤں پلیٹ فارم پر جاؤں؟ آخر تم چاہتی کیا ہو؟“ وہ گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر چلی گئی تھی۔ بچے کو بھی اس کے پیچھے اترنا پڑا۔ وہ چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ گاڑی فوراً ہی چل پڑی۔ بچے نے کہا۔ ”ارے یہاں کیوں کھڑی ہو۔ کیا گاڑی میں نہیں بیٹھتا ہے؟“

”نہیں۔“ وہ بولی۔ ”ہم یہاں سے پیدل اجیر جائیں گے۔“ ”کیا پیدل؟“ بچے نے تقریباً چیخ کر پوچھا۔ ”اجیر یہاں سے پچیس میل دور ہے۔“ وہ اپنے بچے کا ہاتھ تمام کر بولی۔ ”شہنشاہ اکبر اولاد مانگنے کے لئے آگرہ سے فتح پور تیکری تک پیدل گئے تھے اور ننگے پاؤں گئے تھے۔ آپ بھی چلیں۔“ بچے اس کے سامنے ہار کر اسے خوش رکھنا چاہتا تھا۔ وہ پلیٹ فارم سے باہر آیا۔ پھر

اجیر جانے والے راستے کی سمت دیکھ کر بولا۔ ”یا خواجہ غریب نواز! میں اس جلتی دھوپ میں پیدل تیرے در تک آ رہا ہوں تو اس کو کھ جلی کے عقیدے کی لاج رکھتے۔“ وہ چل پڑا۔ نرملہ ٹرین کے سفر میں تمام راستے ہاتھی مارے بیٹھی رہی تھی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پوجا کے انداز میں اس نے رات سے صبح کر دی تھی۔ اس وقت بھی وہ پچیس میل کا راستہ اپنے شوہر کے ساتھ طے کرنے کے دوران اپنے دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے تھی۔ اس کا چہرہ ٹھہر نہیں آ رہا تھا۔ مگر بچے سمجھ رہا تھا کہ وہ گھونگھٹ کے پیچھے روتی جا رہی ہے۔

☆-----☆-----☆

کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ صبح ہوتے ہی مر جائے گا تو مارے قہر کے اس سے رات گزار دی نہیں جائے گی۔ وہ رات کے ایک ایک لمحہ میں جیتے رہنے کے بجائے مرتے مرتے صبح مر جائے گا۔ اگر اسے موت کی خبر نہ ہو تو وہ ایک رات کو قہم میر ہو کر کھائے گا۔ گائے کا ہنسے گا۔ خوب بولے گا۔ بے فکری کی غینہ سوئے گا اور صبح تک سائے خواب دیکھے گا۔ اس کے بعد بلا سے موت آ جائے۔

پرہیز بھی سائے خواب دیکھتے ہوئے سناگ کی بیج پر ہانپنا چاہتی تھی۔ بعد میں بلا سے وہ ہانچہ عورت کی بیج ثابت ہو جائے۔ ہر محل وہ ہر سڑ تھی۔ دل کی عدالت میں وہ ایک عورت کی حیثیت سے نرملہ کی حیثیت کرتی تھی کہ اس ہانچہ عورت سے اس کا شوہر نہیں چھوٹنا چاہتا۔ ورنہ یہ ایک مرد کا بہت بڑا قہم ہو گا لیکن دل کی ایک عدالت میں جذباتی فیصلے بھی ہوتے ہیں۔ ایک فیصلہ یہ تھا کہ یہ مرد کا قہم نہیں ہو گا۔ کیونکہ وہ اولاد کے لئے ایک کو چھوڑ کر دوسری شادی کرے گا۔

پرہیز بڑی کش کش میں دن گزار رہی تھی۔ بچے شہر شہر گھوم کر جب بھی واپس آتا تھا تو ایک رات اس کے ساتھ ضرور گزارتا تھا۔ جب انتخاب کے لئے صرف دو ہفتے رہ گئے تو وہ مصروفیات کے باعث اس سے دور ہوتا چلا گیا۔ یہ اس کی مجبوری تھی۔ انہی دنوں ایک لیڈی ڈاکٹر اس کی سڑک وہ چلی تھی۔ مقدمہ جیتنے کی خوشی میں اس نے ایک شاندار پارٹی دی۔ اس پارٹی میں پرہیز مسلمانہ فحش کی حیثیت سے شریک ہوئی۔ وہاں پر مختلف کھانا پور بیچ گیا۔ سب کچھ کھا کر لذت لیتے تھے لیکن پرہیز نے وہ لقمے کھائے تو ہانچہ کی سی محسوس ہوئی۔ یوں لگا کہ اندر کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔ اگر تیسرا لقمہ منہ تک لے جائے گی تو ابکائی ہونے لگے گی۔

وہ کھانا چھوڑ کر تیزی سے چلتی ہوئی لیڈی ڈاکٹر کی خواب گاہ میں گئی۔ وہاں سے ملحقہ ہاتھ روم میں پہنچی۔ پھر واش روم کے پاس پہنچے ہی اسے تے ہونے لگی۔ تے برائے ہم تھی۔ مگر حسی ہو رہی تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے بیسن پر جھکی رہی۔ اس کا سر ہونے ہوئے پکرا رہا تھا۔ کمزوری لگ رہی تھی۔ اسے اپنی پیٹھ پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ لیڈی ڈاکٹر اس کی پیٹھ سلا رہی تھی۔

پھر وہ اسے سہارا دے کر اپنی خواب گاہ کے بستر پر لے آئی۔ وہاں اس کی جگہ ہوئی

پرہیز نے جب سے نرملہ سے ملاقات کی تھی تب سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ نرملہ سے متاثر ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی باتوں میں اس کے دکھ رکھاڑ میں اور اس کی شخصیت میں کچھ ایسی خوبیاں تھیں کہ وہ اپنے لئے والوں کو جیت لیتی تھی۔ پرہیز نے یہ مان لیا تھا کہ وہ ایک مثالی بیوی ہے۔

اب وہ اکثر سوچتی تھی کہ مرد نرملہ بھی بیویوں کو بھی چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ آخر ان کے لئے محبت کیا چیز ہے؟ کبھی وہ حسن کو چاہتے ہیں، کبھی جوانی کو، کبھی وہ اداؤں پر قربان ہوتے ہیں، کبھی چہرے کے ایک ننھے سے تل پر مر جاتے ہیں اور پندرہ برس تک جی جان سے محبت کرنے کے بعد صرف بچہ نہ ہونے کے سبب اس محبت کو طلاق دے دیتے ہیں۔ آخر ان کے پیار کی کوئی کیا ہے؟

نرملہ سے ملنے کے بعد پرہیز نے اکثر سوچا۔ ”اگر شادی کے بعد میں بھی بچے کے بچے کی ملنا نہ بن سکی تو کیا ہو گا؟“

یہ سوچ کر وہ پریشان ہو جاتی۔ جب وہ پندرہ سال۔۔۔۔۔ کی رفیقہ حیات کو چھوڑ سکتا ہے تو اس سے بھی منہ موڑ سکتا تھا۔ نرملہ نے بڑی فراخ دلی سے پرہیز کو معذورہ بنا دیا تھا کہ وہ شادی سے پہلے اپنا طبی معائنہ کرائے۔ ورنہ ہانچہ ہونے کی صورت میں اس کا انجام بھی نرملہ جیسا ہو گا۔

اب اس کے اندر ایک کش کش تھی کہ اسے اپنا طبی معائنہ کرانا چاہئے یا نہیں؟ ایک تو یہ کہ وہ دنیا کی نظروں میں کنواری تھی۔ ایسا معائنہ بیابہتا عورتوں کا ہوتا ہے۔ اگر اس کا معائنہ ہو بھی جاتا اور نتیجہ میں وہ ہانچہ ثابت ہوتی تو کیا وہ ایسی دل توڑنے والی حقیقت کو برداشت کر لیتی؟

نہیں۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں بچے کی دلیں بننے سے پہلے اسے کھونہ دے۔ اگر کسی

طبیعت کو سمجھنے کے لئے اس کا موازنہ کیا۔ پھر حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ اس نے پوچھا۔
 ”کیا بات ہے؟“

لیڈی ڈاکٹر نے آہستگی سے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”آپ ماں بننے والی ہیں۔“
پرچی نے چونک کر اسے دیکھا۔ پہلے تو اسے یقین نہ آیا۔ وہ یقین کرنے کے لئے
لیڈی ڈاکٹر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ لیڈی ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”آپ کی شادی نہیں
ہوئی۔ یہ کیسے ہو گیا؟“

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ کسی جذبے کی فراوانی سے ختم ہوا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اس کے شانہ کو تھپک کر کہا۔ ”آپ نے مقدمہ جیت کر میری عزت رکھ لی تھی۔ میں آپ کو بدنام نہیں ہونے دوں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں پارٹی فہم ہونے کے بعد اس بچے کو.....“

پر تیری بستر پر پیچھے کھسکتے ہوئے 'لیڈی ڈاکٹر' سے دور ہوتے ہوئے تقریباً چپ کر پڑی۔
 "نہیں۔ خبردار! اس بچے کے لئے کوئی مخصوص بات زبان سے نہ نکالنا۔ یہ میرا بچہ ہے۔ یہ
 ان کا بچہ ہے۔ وہ سنیں گے تو خوشی سے ناچنے لگیں گے۔"
 "کون؟" لیڈی ڈاکٹر نے پوچھا۔

وہ مسرتوں کے ہجوم میں بیڑا رہی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر کا سوال سن کر منبھل مچی۔ ایکشن سے پہلے اور شادی سے پہلے وہ بچے کا نام لے کر اسے بدنام نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کہا: ”یہ نہ پوچھو۔ جب شادی ہوگی تو انہیں دیکھ لینا۔“

وہ حیرانی سے بولی۔ ”آپ اتنی بڑی میر عمر ہیں۔ کیا اتنا نہیں سمجھیں کہ مطلب نکلنے کے بعد مرد کسی کا نہیں ہوتا۔ شادی سے پہلے آپ ماں بننے کے لئے اتنی خوش ہو رہی ہے مگر وہ باپ بننے کے لئے تیار نہیں ہو گا۔“

”کیوں نہیں ہو گا؟ وہ تو پندرہ برس سے باپ بننے کے لئے.....“
وہ کہتے کہتے ٹھک گئی۔ اسے خیال آگیا کہ اس طرح باتوں کی روانی میں بچے کا نام آجائے گا۔ وہ بولی۔ ”بس اس موضوع پر اب میں بات نہیں کروں گی۔“

لیڈی ڈاکٹر اسے آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلی گئی لیکن وہ آرام سے لیٹ نہیں
سکتی تھی۔ اس کے اندر بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جلد از جلد بچے کو یہ خوشخبری سننا

حقیقی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر بجے کی کوٹھی کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف سے
 زلزلے سے رابطہ قائم ہوا۔ اس نے کہا۔ ”ہیلو میں پریق بول رہی ہوں۔ کیا آپ ان سے
 بات کر سکتی ہیں؟“

فرطاً کا مسرور لہجہ سنائی دیا۔ ”اوہ پرچی! کتنے دنوں بعد تم سے رابطہ قائم ہوا ہے۔ وہ گھر میں موجود نہیں ہیں۔ کوئی پیغام دے سکتی ہو تو دے دو۔“

”وہ کہاں مل سکتے ہیں؟“

”وہ خود نہیں جانتے کہ ایک ہل میں یہاں ہیں، دوسرے ہل کہاں رہیں گے۔ ہر وقت! میرا ایک مشورہ مانو گی؟“

”ضرور۔ آج میں بہت خوش ہوں جو جاہیں منوالیں۔“
 ”الکشن کے لئے صرف پانچ دن رہ گئے ہیں۔ اب تم ان سے نہ ملو۔“
 ”لیکن ہم تو بہت محتاط ہو کر ملتے ہیں۔“

”پریتی! مخالف امیدوار کو اہم نہیں سمجھتا چاہئے۔ اس کے آدمی بچے کی کوئی بہت بڑی کمزوری معلوم کرنے کی کوشش میں ہوں گے۔ میں نے بچے سے وعدہ لیا ہے کہ وہ نیشن کانپیدہ ظاہر ہونے تک تم سے نہیں ملیں گے اور نہ ہی فون پر گفتگو کر س گے۔“

پرستی کو یہ بات بری لگی۔ جب سے اس نے اپنے کے آثار پیدا ہوئے تھے تب سے بچے پر اس کا حق زیادہ ہو گیا تھا۔ وہ اس کے ہونے والے بچے کا باپ تھا۔ اب وہ بچے کو بڑے پیار سے حکم دینے والی تھی کہ ایکشن ختم ہوتے ہی فوراً شادی کی جائے تاکہ بچے کے جائز ہونے میں کوئی شہد نہ رہے لیکن نرملہ نے ان کے درمیان دیوار کھڑی کر دی تھی۔

وہیں یہ بات بری لگنے کے باوجود پریتی نے ذہانت سے سوچا کہ فرما درست کہہ رہی ہے۔ تجھے کی کامیابی کے لئے احتیاط لازمی ہے۔ اگر وہ پانچ چھ دن اس سے ملاقات نہ کرے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ تو جس دن بچے والی خوش خبری سنے گا اس دن فرما کو طلاق دے کر اس سے شادی کر لے گا۔ ”آہ بیچارہ فرما.....“ پریتی کو اب بھی اس نتیجہ عورت سے ہر روزی تھی۔

دوسری طرف سے نرملہ کی آواز سنائی دی۔ ”کیا سوچ رہی ہو؟ کیا تم کچھ روز
ناموش نہیں بن سکتیں؟“

"ہاں۔ مگر میں انہیں ایک خوشخبری سنانا چاہتی ہوں۔"

"مجھے سنا دو میں انہیں سنا دوں گی۔"

"وہ خوش خبری سن کر آپ کو دکھ پہنچے گا۔"

"میرے بچے کی خوشی سے مجھے کبھی دکھ نہیں پہنچے گا۔"

"آپ غم کر رہی ہیں تو سن لیں۔ میں مجھے کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

دوسری طرف چپ لگ گئی۔ پرچی انتظار کرتی رہی۔ پھر کئی سیکنڈ کے بعد اس نے

ذوق ہوئی آواز میں پوچھا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ تم؟"

پرچی نے غصے سے نرلا کی آواز آنسوؤں سے بھر گئی ہو۔ وہ بولی۔ "ہاں۔"

ایک لیڈی ڈاکٹر نے میرا معائنہ کرنے کے بعد مجھے یقین دلایا ہے۔"

"لیڈی ڈاکٹر نے بچے کے باپ کو پوچھا ہو گا؟"

"ہاں۔ میں نے اسے نہیں بتایا۔ مجھے بچے کی عزت اور شہرت اپنی عزت سے زیادہ

عزیز ہے۔"

"تم بہت اچھی ہو پرچی! میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔"

"آپ شکریہ ادا کرنے کے بدلے ایک صوفائی کردیں مجھے تک یہ خوشخبری

پہنچادیں۔"

"میں انہیں سنا دوں گی۔"

اتنا کہتے ہی رابطہ فہم ہو گیا۔ شاید نرلا نے اپنا ریسیور رکھ دیا تھا۔ پرچی کی بے چینی

اور بڑھ گئی تھی۔ وہ جلد سے جلد یہ خوشخبری سنے تک پہنچنا چاہتی تھی۔ تاکہ اسے اپنی

زبان سے سنانا چاہتی تھی اور جواب میں اس کی خوشیاں دیکھنا چاہتی تھی اور یہ سب کچھ

اس کی مرضی کے مطابق نہیں ہو رہا تھا۔

اس نے وہ رات بستر پر لیٹتے ہوئے اور اٹھ کر بیٹھتے ہوئے گزار دی۔ صبح ہوئی تو

انکیشن کے لئے چار دن رہ گئے۔ اس نے سوچا یہ ٹھیک ہے کہ ابھی بچے سے نہیں ملنا

چاہئے۔ مخالف امیدواروں کی جانوں سے بچ کر رہنا چاہئے لیکن دماغ میں ایک سوال پیدا

ہوا کہ نرلا نے فون پر بچے سے باتیں کرنے پر بھی پابندی کیوں لگادی؟ فون پر باتیں کر لینے

سے کوئی ان کے تعلقات کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔

اس نے پھر کوٹھی کے نمبر پر بچے کو کل کید نرلا نے جواب دیا۔ "وہ نہیں ہیں۔"

"آپ نے بچے والی بات بتائی تھی؟"

وہ ذرا چپ رہی۔ پھر بولی۔ "نہیں۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے..... بچے

کی بات سنیں گے تو ان کا دھیان ہٹ جائے گا۔ وہ انتہائی مہم پر پوری توجہ نہیں دے

سکیں گے۔"

پرچی نے ذرا غصے سے کہہ۔ "شریستی نرلا دیوی! آپ باتیں بنا رہی ہیں۔ یہ بچہ

میری اور بچے کی محبت اور شادی کی ایک مضبوط کڑی ہے۔ ہم دونوں کو زندگی کی سب

سے بڑی خوشی اسی بچے سے مل رہی ہے۔ بچے کا دھیان نہیں بنے گا اور وہ زیادہ گھن

سے انتہائی مہم پر توجہ دیں گے۔ آپ خاموش کیوں ہیں۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کے

چھپانے سے حقیقت چھپ جائے گی؟ آپ ذہین اور معاملہ فہم ہیں۔ آپ کو چاہئے

کہ....."

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی۔ اسے پتہ چلا کہ وہ روانی میں بولتی چلی جا رہی ہے

اور نرلا نے بہت پہلے ہی ریسیور رکھ دیا ہے۔ اسے بہت غصہ آیا۔ اس نے ریسیور ہٹا دیا۔

بھنبلاہٹ میں بدھرا دھر ٹھٹھنے لگی۔ ذرا دیر بعد اس نے اچانک ہی قہقہہ لگایا۔ "اوہ۔ میں

تو خواہ مخواہ بھنبلا رہی ہوں۔ بھنبلاہٹ میں تو نرلا دیوی جھلا ہوں گی۔ وہ کتنا ہی چھپائی

رہیں۔ بچے کو تو میں جیت رہی ہوں۔"

وہ ذرا مطمئن ہو گئی۔ اس کو ٹھٹھ کے باہر بچے کو ڈھونڈ نکالنا مشکل نہ تھا۔ وہ کہیں

بھی پہنچ کر اسے خوش خبری سنا سکتی تھی مگر اب سرعام اس سے مل کر ایک اسکینڈل کو ہوا

دینا دانشمندی نہیں تھی۔ ابھی ذرا مہر سے وہ خوش خبری سنانے میں بھلائی تھی۔

اس نے شام کو اور رات کو بھی کوٹھی کے نمبروں پر بچے کو آواز دی۔ نرلا نے وہی

جواب دیا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ یوں گٹا تھا جیسے وہ چوبیس گھنٹے ٹیلی فون کے پاس بیٹھی

رہتی ہے اور بچے کو ریسیور اٹھانے کا موقع نہیں دیتی ہے۔ وہ رات بھی گزر گئی۔ اب

انکیشن میں تین دن رہ گئے تھے۔

وہ اپنے دفتر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک ہی بچے کی..... کل آئی۔ پرچی نے

ریسیور کے ماتھ پر چیخ کر کہہ۔ "ہیلو بچے! آپ کہاں ہیں۔ میں دن رات کوٹھی کے

نہروں پر آپ کو پوچھتی رہتی ہوں۔"

دوسری طرف سے ریسپور کے ذریعہ بہت شور مٹائی دے رہا تھا جیسے وہ کسی اجلاس میں شرکت کرنے کے دوران بول رہا ہو۔ "پریتی! میں اس قدر مصروف ہوں کہ ابھی طرح کھانے اور سونے کا وقت نہیں مل رہا ہے۔ تم سے بہت کچھ کہنا ہے مگر صبر کر رہا ہوں۔"

"آپ صبر کریں مگر میں یہ خوشخبری سنا کر رہوں گی کہ....."

بچے نے جلدی سے بات کاٹ کر کہہ دی۔ "بس رک جاؤ۔ فون پر کچھ نہ کہنا مجھے نرملا نے بتا دیا ہے پریتی! میں بڑی الجھنوں میں ہوں۔ بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ چار دن تک میرے بیٹھی رہو مجھے یقین ہے کہ تم میری مجبوریاں سمجھ رہی ہو گی۔"

دوسری طرف بچے کے علاوہ اور کسی شخص کی آواز سنائی دی۔ اس سے دور اور کتنے ہی لوگ بول رہے تھے۔ بچے نے ریسپور رکھ دیا۔ پریتی اپنے ہاتھ میں ریسپور پکڑے سوچتی رہ گئی۔ ٹیلی فون پر مختصر سی گفتگو میں یہ معلوم ہوا کہ نرملا نے بچے کے متعلق بچے کو بتلایا ہے لیکن وہ اس قدر مصروف ہے کہ بچہ کوئی خاص خوشخبری کا باعث نہ بن سکے۔ وہ مجبوریاں اور الجھنیں بھی ظاہر کر رہا تھا۔ یوں بھی پریتی سمجھتی تھی کہ جسے پوری طرح کھانے اور سونے کی فرصت نہ مل رہی ہو اسے کس قدر ذہنی پریشانیاں ہوں گی اور ذہنی پریشانیوں کے دوران خوشیاں کوئی خاص رنگ نہیں جمتی ہیں۔

اس نے ریسپور رکھ دیا۔ وہ بچے کی مجبوریاں کو سمجھتی تھی۔ اس کے باوجود اس کے اندر کی بے چینی نہیں جا رہی تھی۔ وہ اپنے وجود کے اندر بچے کے بچے کو پالنے لگی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ سب مل کر دیوانوں کی طرح خوشیاں منائیں۔ دھرم اور سماج اب اسے ملنا بننے کا اپوارڈ دے۔ کیونکہ وہ اس دین کے لئے بچے جیسے ذہین اور عقل سیاستدان کے بچے کو جنم دینے والی تھی۔

شام کو دل کی بے کلی نے گھر سے باہر جانے پر مجبور کیا۔ اس وقت رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اس نے سوچا ٹھیک ہے مجھے بچے سے نہیں ملنا چاہئے لیکن میں نرملا سے مل سکتی ہوں۔ ایک عورت دوسری عورت سے ملے تو کوئی اسکیڈل نہیں بنائے گا۔ میں نرملا سے ملے جاؤں گی اور وہاں بچے مل جائیں گے۔ کوٹھی کے اندر کون دیکھنے آئے گا کہ میں

کس سے مل رہی ہوں۔

وہ اپنے ہی سامنے اس کوٹھی میں جانے کا جواز پیش کرتی ہوئی۔ اپنے ہی آپ کو قائل کرتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ نرملا پہلے تو اسے دیکھتے ہی پریشان ہوئی پھر وہ مسکراتی ہوئی ہوئی۔ "آؤ اندر آجاؤ۔"

پریتی نے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اندر جانے والے دروازے کی طرف دیکھ کر نرملا نے کہہ دی۔ "وہ اندر نہیں ہیں۔ کل سے گھر نہیں آئے ہیں۔ شاید ابھی آجائیں۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے صوف پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ پریتی نے محسوس کیا کہ نرملا پریشان اور فکر مند ہے۔ اس نے پوچھا۔ "بچے کل سے کہاں نہیں آئے؟"

نرملا نے جواب دیا۔ "یوں تو مصروفیات بہت زیادہ ہیں انہیں گھر آنے کی بھی فرصت نہیں ملتی لیکن وہ کل تک تھوڑی دیر کے لئے ضرور آتے تھے۔ جب سے میں نے بتایا ہے کہ تم ان کے بچے کی مل بننے والی ہو تو وہ باہر اور زیادہ مصروف ہو گئے ہیں۔ شاید انہیں اس گھر سے دور رہ کر سکون مل رہا ہے۔"

پریتی اندر ہی اندر خوشیوں سے بھر گئی۔ اس کے ہونے والے بچے نے بچے کو نرملا سے دور کر دیا تھا۔ اس نے سوچا۔ "واقعی وہ میرے پاس آنے اور بچے کی خوشی میں مجھے گلے لگانے کے لئے یہ تائب ہوں گے لیکن حالات سے مجبور ہیں۔ اب وہ اس گھر میں بھی نہیں آتے۔ ایک ہانچہ بیوی کی قربت ناگوار گزرتی ہو گی۔ بچے سے غالی گھر کو دیکھ کر وحشت سی ہوتی ہو گی۔"

سوچنے کے دوران ملازمہ نے آکر کما میز پر کھانا لگا دیا گیا ہے۔ نرملا نے پریتی سے کھانے کے لئے کہہ دی۔ پریتی نے جواب دیا۔ "میں ان کا انتظار کروں گی۔"

"وہ مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ کبھی کھانے پر ان کا انتظار نہ کیا جائے۔ وہ آج کل باہر سے..... کھا کر آتے ہیں تم کھانے کے بعد بھی ان کا انتظار کر سکتی ہو۔"

پریتی صوف سے اٹھ گئی۔ ڈرائنگ ٹیبل کی طرف جانے ہوئے نرملا نے کہہ دی۔ "میں ابھی اپنے کمرے سے آئی ہوں۔"

وہ جلدی سے راستہ بدل کر اپنی خواب گاہ کی طرف چلی گئی۔ پریتی کھانے کی میز کے

پاس آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ بچے کے گھر میں آکر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کا اپنا گھر ہو۔ مگر وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جیسے صدیوں سے گھبڑا ہوا قند دس منٹ کے بعد نرملا داخل آئی۔ پریتی نے دیکھا۔ وہ زرد پڑ گئی تھی۔ اس کے بالوں کا بخوڑا کھل گیا تھا اور وہ بڑی کمزور سی لگ رہی تھی۔

پریتی نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ کیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟“
”ہاں۔ کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔“

یہ کہہ کر نرملا نے کھانے کی میز پر سے ایک چاندی کی کنوری اٹھائی۔ پھر اسے اپنے سامنے رکھ کر اس میں سے اجار کا ایک ٹکڑا نکال کر چاٹنے لگی۔ پریتی کے صدمہ میں پانی آگیا۔ ایسے وقت عورت کھٹے کے لئے لچھاتی ہے۔ اس نے چاندی کی دوسری کنوری اٹھا کر اپنے پاس رکھی۔ پھر اس نے بھی اجار کا ایک ٹکڑا نکالا۔ اسے اپنی زبان پر رکھا۔ پھر ایک دم سے چونک کر نرملا کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آ..... آپ رات کو اجار کھا رہی ہیں۔ یہ کھانا کھانے کا کوئی وقت نہیں ہے۔“

”پھر تم کیوں کھا رہی ہو؟“
”میں تو بچے کی ماں.....“

پریتی کی آواز طلق میں اٹک گئی۔ نرملا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی ماں بننے والی ہوں۔“

”نہیں۔“ پریتی چیخ کر کھڑی ہو گئی۔ ”آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ آپ ہاتھ ہیں۔ چند روزہ سولہ برس سے ہاتھ ہیں۔“

”اب نہیں رہی۔ بعض ہاتھ عورتیں بیس برس کے بعد بھی ماں بن جاتی ہیں۔ قدرت کے قہاروں کو ہم تم نہیں سمجھ سکتے۔ بیٹھ جاؤ۔“

وہ کبھی نہ ٹیٹتی لیکن حالات کے اس ڈرامائی انداز سے سر پکڑ رہا تھا۔ اس لئے بیٹھ گئی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نرملا کو دیکھتی رہی۔ اب بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سامنے والی عورت ماں بن سکتی ہے۔ سامنے والی عورت نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ”یقین کرلو۔ ایک لیڈی ڈاکٹر نے میرا بھی معائنہ کیا ہے میں نے تم سے پہلے یہ خوش خبری ان کو سنائی تھی۔ وہ بہت خوش تھے۔ مصروفیات کے باوجود صبح دوپہر اور شام کو کھانے

کے لئے ضرور آتے تھے۔ کل جب انہیں پتہ چلا کہ تم بھی.....“

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ جیسے آنسو طلق میں آکر اٹک گئے ہوں۔ پھر وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”جب میں ہاتھ تھی تو ان کا بھوکا تسماری طرف زیادہ تھا۔ جب لیڈی ڈاکٹر نے میرے حاملہ ہونے کی تصدیق کی تو انہوں نے خوش ہو کر مجھے گلے لگالیا۔ میرے ہونے والے بچے نے اس بات کی ضمانت دے دی تھی کہ مجھے طلاق نہیں ہوگی مگر تمہارے ہونے والے بچے نے میرا اطمینان ختم کر دیا ہے۔“

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ ایک میز کے اطراف ایک دوسرے کے روپہ رو تھیں۔ دونوں اپنی کونکھ میں ایک ہی مو کا بچہ لئے بیٹھی تھیں۔ پت نہیں وہ موکس کی طرف جھٹکتے والا تھا؟ کس کے حق میں فیصلہ دینے والا تھا۔

نرملا نے کہا۔ ”وہ کل سے میرے پاس نہیں آئے۔ وہ مجھے چاہتے ہیں۔ نہیں بھی چاہتے ہیں اور اب کش کش میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ اب اولاد کو بنیاد بنا کر مجھے طلاق دینے اور تم سے شادی کرنے کا وقت گزر چکا ہے۔ اب صاف طور سے انہیں کہنا ہو گا کہ وہ ہم دونوں میں سے کسے زیادہ چاہتے ہیں؟ کس کی ضرورت زیادہ سمجھتے ہیں۔“

پریتی سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ نرملا کی آنکھوں سے آخر آنسو اٹلی ہی پڑے۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ میں چند روزہ برس پرانی ہو چکی ہوں اور تم ابھی تازہ روزہ ہو۔ بیوی کے حقوق قانونی ہوتے ہیں لیکن مرد محبوبہ کو حقوق زیادہ دیتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ تم دونوں قانون داں ہو۔ مجھے طلاق دینے کے کتنے ہی قانونی کتے نکال لو گے۔“

پریتی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”میں عورت ہوں اپنے ہاتھوں ایک عورت کا گھر برباد نہیں کر سکتی لیکن میں خود برباد ہو چکی ہوں۔ پہلے میری محبت کا مسئلہ تھا اب میرے بچے کے مستقبل کا سوال ہے۔ میں آپ کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں مگر اپنے بچے کے باپ کا نام کسی کو نہیں دے سکتی۔“

وہ پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”دیوی بی! یہ ہمارا نہیں بچوں کا مسئلہ ہے۔ اگر آپ کو طلاق مل جائے تب بھی آپ کا بچہ قانونی ہو گا اور اس کے باپ کا نام ملے گا۔ کتنی ہی رہے گا۔ اگر بچے سے میری شادی نہ ہوئی تو میرا بچہ کیسے کا نہ رہے گا۔ آپ کو

صرف اپنے بچے سے ہمدردی نہ ہو۔ تھوڑی ہمدردی میرے بچے سے بھی ہو تو آپ سوچیں کہ انصاف کس بچے سے ہونا چاہئے؟

اس بار نرملا کا سر جھک گیا۔ پرتی نے کہل۔ "انصاف کرنے والے میرے بچے کو ناجائز کہہ سکتے ہیں لیکن بچہ کبھی ناجائز نہیں ہو سکتا۔ حرامی وہ نہیں ہوتا اس کے ماں باپ کی حرکتیں۔۔۔۔۔ ہوتی ہیں۔ سزا کے طور پر مجھے اور بچے کو سولی پر چڑھایا جاسکتا ہے لیکن میرے بچے کو ہر حال میں اس کے باپ کا نام ملنا چاہئے۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کرسی ایک طرف ہٹا کر جانے لگی۔ پھر ڈانٹنگ روم کے دروازے پر پہنچ کر رکھ گئی۔ اس نے پلٹ کر نرملا کو دیکھا اور کہل۔ "ہم عورتوں کے سوچنے اور کسی فیصلے تک پہنچنے سے کیا ہوتا ہے؟ تشدد کی ابتدا سے ہماری تقدیر مرد کی مٹھی میں رہی ہے۔ ہم دونوں بچے کے فیصلے کی محتاج ہیں اور میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ کس انداز میں فیصلہ کریں گے۔"

نرملا نے مضطرب ہو کر پوچھا۔ "وہ کس انداز میں فیصلہ کریں گے؟"

پرتی نے جواب دیا۔ "انہیں فرض آپ کی طرف لے جائے گا لیکن محبت میری طرف کھینچ کر لاتی رہے گی۔ میں کچھ اور وضاحت سے کہہ دوں کہ اگر بچے الیکشن میں جیت جائیں گے تو میں ہار جاؤں گی۔ کیونکہ وہ عزت اور شہرت کی بلندیاں پر پہنچ کر ایک حاملہ داشتہ کی خاطر اپنی حاملہ بیوی کو حلاق نہیں دے سکیں گے۔"

خود کو داشتہ کہتے وقت پرتی کے دل کو غصہ بھی لپکتا تھا لیکن وہ بولتی رہی۔ "مگر وہ الیکشن میں ہار جائیں گے تو میں جیت جاؤں گی۔ وہ میری خاطر سیاسی اور سماجی سرگرمیاں چھوڑ کر مجھ سے شادی کریں گے اور میرے بچے کو اپنا نام دیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے پلٹ گئی۔ پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔ پھر اس نے گھوم کر کہل۔ "یہ الیکشن صرف بچے اور اس کے مخالف امیدوار کے لئے نہیں ہے۔ اس الیکشن میں میں اور آپ بچے کی امیدوار ہیں۔ وہ جیت کر آپ کے ہوں گے اور ہار کر میرے بن جائیں گے۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ الیکشن ہم دو عورتیں لڑ رہی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر چلی گئی۔

☆-----☆-----☆

پرتی نے دفتر میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ ہفتہ تک وہ کوئی مقدمہ ہاتھ میں نہیں لے گی۔ ان دو ہفتوں میں جن مقدمات کی پیشی کے لئے عدالت سے تاریخیں دی گئی تھیں۔ انہیں آگے بڑھانے کے لئے اس نے عدالت میں درخواست دے دی تھی۔ ابھی دل اور دماغ گھبراہٹ میں نہیں تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر بچے کو ان تین دنوں میں جیت لے گی تو شادی کے بعد ہی مون منانے کے لئے دو ہفتوں کی چھٹی لازمی ہوگی اور اگر اسے ہار جائے گی تب بھی رونے ماتم کرنے اور سنبھلنے کے لئے دو ہفتے کی صلت ضرور ہوگی۔

کئی کام نہ کرنے کے باوجود وہ اس خیال سے دفتر آئی تھی کہ شاید پھر بچے کا فون آجائے اور دوسرے دن فون آئی گیا۔ اس نے ریسپونڈ اٹھا کر اس کی آواز سنی تو دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "پرتی! بھئی رات میں نے نرملا کو فون کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ تم وہاں گئی تھیں۔ میں دو دنوں سے بہت پریشان ہوں۔ کل رات تم نے نرملا سے جو کچھ کہل اسے سن کر میری پریشانیوں کچھ کم ہو گئیں ہیں۔"

پرتی نے کہل۔ "میں نے نرملا دیوی سے بہت سی باتیں کی تھیں۔ میری کس بات سے آپ کی پریشانیوں کم ہو گئیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "یہ کہ جیتنے کے بعد نرملا کا ہی رہوں گا اور ہارنے کے بعد تمہارا بن جاؤں گا۔ تم نے اپنے خیال کے مطابق نرملا کو۔۔۔۔۔ یہ فیصلہ سنایا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے ہمارے انداز میں فیصلہ نہیں کر سکیں گے۔"

پرتی نے پوچھا۔ "میں آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ کیا آپ کو یہ سن کر خوش نہیں ہوئی؟"

"میں اپنی خوشی بیان نہیں کر سکتا۔ یقین کرو کہ اس الیکشن سے میری دلچسپی ختم ہو گئی ہے۔ میں ہار جانا چاہتا ہوں۔ میں صرف تمہیں جیتنا چاہتا ہوں تم سے ہونے والے بچے کو مکمل تحفظ دینا چاہتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "الیکشن میں آپ کی کامیابی سے مجھے اور بچے کو نقصان پہنچے گا۔ پھر بھی میں آپ کی کامیابی چاہتی ہوں۔ کاش کوئی ایسی صورت ہوئی کہ میں ٹاکسی سے مر جائی مگر میرے بچے کو آپ کا نام مل جائے۔"

"ایسا ممکن نہیں ہے پرتی! میں سوچ سوچ کر پریشان ہوں کہ تم سے شادی نہ کر سکا

آخر انکیشن کا دن طلوع ہو گیا۔ وہ صبح سے پریشان ہونے لگی۔ آج رات تک اس کی تقدیر کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ اس نے پروگرام بنایا تھا کہ کھل نتیجہ شربونے تک وہ اپنی خواب گاہ میں رہے گی اور لی دی کو آن رکھے گی۔ ہاں ووٹ ڈالنے کے لئے اہلہ باہر جانا پڑا۔

دور دراز پوچھ کے اندر جاتے وقت اس کے ہاتھ میں ایک قیمتی ووٹ کی پرہی تھی۔ دل جیزی سے دھڑک دھڑک کر سمجھا رہا تھا۔ ”پرہی! ذرا سوچ سمجھ کر“ اگر تم بچے کے حق میں ووٹ دو گی تو وہ ووٹ تمہارے خلاف ہو گا۔ تم بچے کے خلاف امیدوار کو ووٹ دے کر کامیاب ہو سکتی ہو۔“

لیکن محبت محبوب سے ہوتی ہے محبوب کے عروج سے ہوتی ہے، زوال سے نہیں ہوتی۔ وہ بچے کے حق میں اور اپنی مخالفت میں ووٹ دے کر پوچھ سے باہر آئی۔ اب وہ انجام کے متعلق کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ جو ہوتا ہے وہ ہوتا رہے گا۔ اس نے سوچا کہ وہ کچھ نہیں سوچے گی اور کچھ نہیں سوچنے کی بات سوچتی رہی۔

وہ اپنی خواب گاہ میں کبھی اٹھ رہی تھی کبھی بیٹھ رہی تھی اور کبھی شل رہی تھی۔ ٹھیک سات بجے شام کو لی دی کے انڈانسر نے کلمہ ”ناظرین! جیسا کہ آپ جانتے ہیں حلقہ نمبر ۱۱ میں بچے کمٹی اور گوبال کھولنے کے درمیان مقابلہ ہوا۔ اہم اس کا نتیجہ پیش کر رہے ہیں۔“

پرہی صوفہ پر بیٹھ گئی۔ صوفہ کے ہتھکڑوں کو اس نے دونوں طرف سے مضبوطی سے پکڑ لیا تھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لی دی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ وہ انڈانسر..... لاکھوں ناظرین اور کھڑوں سامعین کو ایک کنواری ماں کی تقدیر کا فیصلہ سن رہا تھا کہ آج کے بعد اس کا بچہ جائزہ کھائے گا۔ یا پھر ماں کی کوکھ ہی اس بچے کا مقبرہ بن جائے گی۔

انڈانسر نے کلمہ ”ابتدائی نتیجہ کے مطابق شریمان گوبال کھولنے نے اب تک دو لاکھ اکیس ہزار تین سو پچھتر ووٹ حاصل کئے ہیں اور شریمان بچے کمٹی کے حصے میں دو لاکھ چودہ ہزار آٹھ سو پچاس ووٹ آئے ہیں۔ اس گنتی کے مطابق شریمان گوبال کھولنے نے تین فیصد ووٹ زیادہ حاصل کئے ہیں۔“

پرہی کے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی تقدیر

تو ساری عمر تمہاری اور بچے کی بدنامی کا باعث بنا رہوں گی۔“
”ہم سے بڑی سنگین غلطی ہو گئی۔ ایسی غلطی کی سزا کسی کو نہیں ملتی اور کسی کو ملتی ہے۔ میں انتظار کروں گی کہ مجھے کیا ملتا ہے اور کیا نہیں ملتا؟ ایک بات آپ یاد رکھیں۔ اگر فیصلہ نرملہ دیوی کے حق میں ہوا تو پھر آپ میری طرف کبھی رخ نہیں کریں گے۔ کبھی اپنی آواز بھی مجھے نہیں سنائیں گے۔“

”ایسا نہ کہو پرہی! میں سوچ رہا ہوں کہ بیوی نہ بنا سکا تو مہربانی کے بعد تمہیں پرسل سیکرٹری بنا کر اپنے قریب رکھنا چاہیے گا۔“

”پرسل سیکرٹری کے بچے کا کیا بنے گا؟ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں بیوی نہ بنا سکی تو سیکرٹری کے بدلے دانش بن کر رہوں گی۔ کیا اتنے عرصہ میں آپ نے یہی میرے مزاج کو سمجھا ہے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ میں بیوی بننے کا خواب دیکھتے ہوئے خود کو آپ کے حوالے کرنے کی حماقت کرتی رہی۔ اس حماقت کی سزا مجھے ہی ملے گی۔ آپ مجھے دانش بنائے رکھنے کی بات کہہ کر میری توہین تو نہ کریں۔“

”سو رہی پرہی! میں تمہیں قریب رکھنے کی کتنی ہی الٹی سیدھی تحریروں سوچ رہا ہوں۔ صرف تمہاری محبت میں ایسی غلط بات کہہ گیا۔ آئندہ غلط رہوں گا۔“

”ہماری زندگی میں آئندہ تین دن ہی رہ گئے ہیں۔ تین دن بعد یا تو آپ بیٹھ کے اپنے مجھے ہتھیلیں دے پا پھر کبھی اپنی صورت نہیں دیکھائیں گے۔ ابھی آپ وعدہ کریں۔“

ایک طویل سانس چھوڑنے کی آواز آئی۔ پھر اس نے کلمہ ”اچھا وعدہ کرنا ہوں۔ مجھے اب اجازت دو اور انکیشن میں میری ناکامی کی دعا مانگتی رہو۔“

سلسلہ متعلق ہو گیا۔ پرہی ریسیور دکھ کر بچے کو تصور میں دیکھنے لگی۔ اس سے جو گفتگو ہوئی تھی۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اس نے نرملہ کے متعلق بات کی مگر اس سے ہونے والے بچے کو نظر انداز کرنا رہا اور پرہی سے ہونے والے بچے کے متعلق کی بات کرنا رہا۔ یعنی نرملہ اس کے بچے کی ماں بن کر بھی اسے جیت نہیں سکتی تھی۔ اس کے دل و دماغ پر پرہی کی حکومت تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ انکیشن میں کامیابی کے بعد وہ نرملہ کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو جائے۔

یہ بات درست تھی کہ وہ انکیشن دو عورتیں ٹک رہی تھیں۔

کافیصلہ فیصلہ کے حساب سے سٹایا جا رہا ہو اور لاکھوں کروڑوں لوگ اسے ایک ایک ووٹ کی بھیک دے رہے ہوں۔ دھیرے دھیرے بتا رہے ہوں کہ بچے کے ساتھ وہ رہے گی یا نہ رہے گی؟

بچے تین فیصد ووٹوں سے ہار رہا تھا۔ اس بات کا اسے دکھ ہوا لیکن یہ تقدیر کا فیصلہ تھا۔ پرتی کے سر سے جیسے کوئی بوجھ اتر گیا تھا اس کے اندر ایک انگڑائی پھلنے لگی۔ اس نے انگڑائی لی تو بھوک گھٹنے لگی۔ یاد آیا کہ اس نے فکر اور پریشانی میں صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ گھر میں ڈبل روٹی رکھی ہوئی تھی۔ وہ ٹی وی کا ساؤنڈ بڑھا کر اڑا پوچھ کرنے کے لئے کچن میں چلی گئی۔

ٹی وی کی آواز کچن تک پہنچ رہی تھی۔ کبھی گانے اور جیسی مذاق کا پروگرام پیش کیا جاتا تھا اور کبھی الیکشن کے نتائج پیش کئے جاتے تھے۔ رات کے دس بجے بھی گوپال کھوٹے تین فیصد کی برتری حاصل کر رہا تھا۔ پرتی بے اختیار ہنستا رہی تھی۔ وہ خوش نہیں ہونا چاہتی تھی لیکن مقدار اسے خوش کر رہا تھا۔

رات کے ایک بجے تک اسی فیصد ووٹ گتے جا چکے تھے۔ گوپال کھوٹے اب بھی ڈھائی فیصد کی برتری حاصل کر رہا تھا۔ بچے مکرچی کی فکست طے شدہ تھی۔ پرتی لباس تبدیل کرنے لگی۔ اس نے سنگھار کیا۔ بہترین ساڑھی پہنی۔ آخری نتیجہ سننے ہی وہ بچے سے اپنی کامیابی کی مبارک باد حاصل کرنے کے لئے اس کی کونٹھی کی طرف جانے والی تھی۔

دو بج کر چالیس منٹ پر اچانک ہی انڈیا ٹیلی ویژن نے "بھارتی پارلیمنٹ کے انتخابات میں یہ حیرت انگیز مقابلہ ہے۔ دہلی سے موصول ہونے والے آخری نتیجے کے مطابق مسٹر بچے مکرچی نے مسٹر گوپال کھوٹے کو ایک فیصد ووٹوں سے فکست دے دی ہے۔ ہم مسٹر بچے مکرچی کو کامیابی کی مبارکباد دیتے ہیں۔"

فیصلہ ہو گیا۔ پرتی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ اسکرین پر بچے کی تصویر دکھائی جا رہی تھی لیکن پرتی کی آنکھوں میں اتنے آنسو تھے کہ وہ تصویر 'وہ ٹی وی اور آس پاس کی دنیا دھندلا رہی تھی۔

اس نے آہستہ آہستہ ساڑھی اتار دی۔ تقدیر نے اب اسے کنگن کر دیا تھا۔

اس نے بھڑا کھول دیا۔ جوانی کی بھول اب ہال کھول کر ملائے گی۔

ٹی وی کو بند کر دیا۔ کیونکہ بچے کی صورت آنکھوں سے بچکنے کی بات طے پا چکی تھی۔ اب وہ کیسے زندگی گزارے گی؟ اب اس بچے کا کیا بنے گا؟ اب یہ سارے مسائل اس کے اپنے تھے۔ اسے بچے کے ساتھ جینا تھا یا مرنا تھا۔ یہ فیصلے دوسرے دن بھی ہو سکتے تھے۔ ابھی بچے کی اچانک جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ دل کٹ رہا تھا۔ وہ آخری بار اپنے محبوب سے لپٹ کر رونا چاہتی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میلے کپڑوں کی ہاسٹ کے پاس گئی۔ وہاں سے اس نے بچے کی فیض اور پاجامہ نکل کر پین لیا۔ کپڑے پین..... کر دوڑائی ہوئی آئی اور بستر پر اونگھ مٹ کر کمرہ حائضیں بار بار کر رونے لگی۔

☆-----☆-----☆

وہ اچانک ہی چہی کے دہانے پر پہنچ گئی تھی۔ اب آنے والے دن اس کے منہ پر قہقہے ہوئے گزرنے والے تھے۔ وہ ایک ہر سڑکی حیثیت سے بڑی محبت اور ذہانت سے اپنا کیریئر بناتی آئی تھی۔ اب اس کے تمام کیریئر پر ایک گناہگار کے منہ کی طرح کلک پھرنے والی تھی۔ وہ بچہ جو پیار کا انعام ہوتا۔ وہ اب گل بن کر اس کی کونٹھ سے جنم لینے والا تھا۔

اس رات وہ روتے روتے سو گئی۔ دن کے دس بجے آنکھ کھلی تو دل کو دھچکا لگا۔ اس کا بستر بچے کے بھاری بھر کم وجود سے خالی تھا اور اب بیٹھ خالی رہے گا۔ ایک دم سے یوں لگا جیسے وہ بستر کی طرح اندر سے بالکل خالی ہو گئی ہے۔ بچے اس بستر کے سارے ارمان سارے چنے اس کے اندر سے نوج کر لے گیا ہے۔ ایک بن بیانی عورت کے لئے یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ اس سے اس کی سچ کے سارے چنے چھین لئے جائیں۔

وہ پھر رونے لگی۔ پتہ نہیں کیوں رونا اسے اچھا لگ رہا تھا جیسے اوپر سے کوئی بوجھ اتر رہا ہو۔ وہ کبھی آپس بھر کر چپ ہو جاتی اور کبھی پھر رونا شروع کر دیتی۔ دوسرے تک یہ سمجھ میں آیا کہ کوئی اس کے آنسو پونچھنے نہیں آئے گا بلکہ آنسو دیکھنے بھی نہیں آئے گا۔ جب وہ چند ماہ بعد گھر سے نکلا کرے گی تو لوگ اس کے آنسو نہیں اس کا پیٹ دیکھا کریں گے۔

وہ بے اختیار اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے وجود کے اندر بجے کی
شکلی کیس جیسی ہوئی تھی اور ہل وہ پرورش پاری تھی۔ ابھی پیٹ پر ہاتھ رکھنے سے
اس کا سرخ نہیں مل رہا تھا۔ ابھی تک صرف ایک ہی لیڈی ڈاکٹر نے سرخ لگایا تھا کہ
بچہ ہے اور وہ بچہ اب صرف پرہیز کا تھا۔ اسے کسی باپ کا نام نہیں ملے والا تھا۔
وہ یہ سوچتے ہوئے آنسو پونپھنے لگی کہ رونا تو ساری زندگی کا ہے لیکن سب سے
پہلے اس بچے کا تحفظ ضروری ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے اشارہ کیا تھا کہ وہ اس بچے کو ضائع
کر سکتی ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی اور پرہیز کی عزت رو جائے گی۔ وہ پھر سے غیر
شادی شدہ کہلائے گی۔

بچے نے محبت کی ایسی بامباری تھی کہ اب غیر شادی شدہ کھلوانے کا شوق نہیں رہا تھا۔ وہ محبوبہ کی حیثیت سے ہار چکی تھی لیکن ماں کی حیثیت سے اولاد کو ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بچہ اس کی باری ہوئی محبت کا سرمایہ تھا۔ اب وہ اسی طرح چیت رہی تھی کہ بچے جانے کے باوجود اس کے اندر سے نہیں گیا تھا۔ وہ ہر حال میں اس بچے کا تحفظ چاہتی تھی۔ اسے جہنم دے کر دوسرا بچہ بنانا چاہتی تھی اور ایسا کرنے کے لئے اس بچے کو ایک باپ کا نام دینا ضروری تھا۔

تو پھر اسے کس باپ کا نام ملے گا؟ کیسے ملے گا؟ اگر ملے گا تو اسے بچے کا باپ بنانے سے پہلے اپنا شوہر بنانا پڑے گا اور یہ بات ایسی تھی کہ سوچنے سے اس کے عورت پن کو عیس پہنچتی تھی۔ ایک تو اس نے سنا تھا کہ برس تک شادی کے متعلق سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے ملک کی نامور بیئر مشین بناتی تھی۔ ناموری کے لئے بچے کا سہارا لیا تو اس کے آگے سب کچھ ہار لی چلی گئی۔ وہ کوئی بازاری عورت تو تھی نہیں کہ ایک کے بعد دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتی۔ وہ بچے کے بعد اپنی ذات پر کسی کا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اسی سوچ میں سارا دن ساری رات گزر گئی کہ شادی کے بغیر اس کے بچے کو باپ کا نام اور دنیا میں جائز مقام کیسے ملے گا؟ اسے جلد سے جلد فیصلہ کرنا تھا۔ وہ سوچنے میں جتنے دن ضائع کرتی، اپنی اور بچے کی بدنامی مقدور ہوتی جاتی لیکن اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہیں۔ اگر وہ کسی سے مشورہ نہیں لے گی تو ذلت کی پستیوں میں گر کر رہ جائے گی۔

وہ اپنی اس موکلہ لیڈی ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئی۔ وہی ایک عورت اس راز کو جانتی تھی۔ اس نے پریتی کی ساری چٹاٹنے کے بعد کہا۔ ”پریتی جی! میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ یہ مرد کس کے؟ مطلب نکلا کھینکے۔ میں بھوٹ نہیں بولتی۔ میرے پاس آئے دن ایسے درجنوں کیس آتے ہیں اور میں ان لڑکیوں کو مل جلنے سے نجات دلا دیتی ہوں۔“

پرچی نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ جلدی سے ہوئی۔ ”اما آپ بہت بڑی ہیڈ مشین ہیں اور میں قانون کے خلاف ایسے کام کرتی ہوں مگر یہ تو سوچیں کہ میں کتنے گھرانوں کی عزت رکھ لیتی ہوں میرے بیٹے میں ہزاروں راز دفن ہیں اور آپ کا راز بھی میرے ساتھ میری جہاں تک جائے گا۔“

پریقی نے ٹھوس لیے میں کہہ "میں ہیں اپنی مٹا کا گھوٹے نہیں آئی ہوں۔ میں اس بچے کی سلامتی کے لئے تم سے مشورہ لینے آئی ہوں۔"

لیڈی ڈاکٹر نے حیرانی سے پوچھا۔ "آ۔ آپ اسے ضائع نہیں کریں گی؟ آپ اسے جہنم دیں گی؟"

”ہاں۔ ہر حال میں جہنم دیوں گی۔“

”پرہیزچی! آپ کوئی منہم ہستی نہیں ہیں۔ آپ کی عزت ہے، شہرت ہے۔ یہاں سے دلی تک بدلتوں میں آپ کے نام کا رعب اور دہدہ ہے۔ کیا آپ۔۔۔۔۔“

پریتی نے بات کات کر کہل "میں یہ سب کچھ داؤ پر لگاؤں گی۔ تم عورت ہو۔ یہ سوچ کہ اپنی آمد دسے کہ جس بیچ کو حاصل کیا ہے وہ میرے لئے کتنا اہم ہوگا۔"

لیڈی ڈاکٹر بدستور حیرانی سے اس کا منہ تک رہی تھی۔ وہ بولی۔ "میں تم سے مشورہ لینے آئی ہوں کہ میرے بچے کو ایک باپ کا کام کیسے ملے گا؟ میں بہت ابھری ہوئی ہوں۔ میرا ذہن کام نہیں کر رہا ہے۔"

”آپ مجھے اس آدمی کا نام بتائیں، جس نے آپ کو جلا دیا ہے۔“

”اس کا نام میرے ساتھ میری چمک جائے گا۔“

”ادھر۔ آپ اب بھی اس کی عزت رکھ رہی ہیں۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی آپ اسے اس قدر چاہتی ہیں۔“

”میں جاہت کا حساب کرتے نہیں“ اپنے بیچے کی سلامتی کے لئے کوئی راستہ

ڈھونڈنے آئی ہوں۔"

"ایک ہی راستہ ہے" آپ جلد سے جلد شادی کر لیں۔ جو بھی شوہر ہو گا۔ وہ حقیقت کو سمجھ نہیں پاسے گا۔ ایک مرد نے آپ کو دھوکا دیا۔ آپ دوسرے مرد کو دھوکا دینے کا حق رکھتی ہیں۔ ہم اپنی دنیا میں فریب کھائے اور فریب دیئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

"میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ ایک کے بعد دوسرے مرد کا سایہ بھی مجھے ناگوار گزرے گا۔ کیا اور کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی؟"

لیڈی ڈاکٹر باور سے اوجھڑتے ہوئے سوچتے گئی اور بیڑا سنبھالنے لگی۔ "بڑی مشکل ہے۔ شادی کے بغیر بچہ جائز نہیں ہو گا۔ آپ سنا رہی ہیں۔ جوانی میں اور مرد بڑے غریب ہیں۔ اگر کوئی آپ سے ہمدردی کے لئے تیار بھی ہوا تو آپ کو آپ سے وصول کئے بغیر اس بچے کا باپ بننے کے لئے راضی نہیں ہو گا۔ پھر یہ کہ کسی کو بتانا ہی نہیں ہے کہ آپ پہلے سے حاملہ ہیں اور آپ کسی مرد کو..... اپنے پاس ہمداشت نہیں کرنا چاہئیں بڑی مشکل ہے۔ بات کیسے بنے گی؟"

وہ بیڑا سنبھالنے کے دوران رک گئی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "ایک تدبیر ہے کسی بہت ہی بوڑھے اور بالکل ہی ناکارہ آدمی سے آپ شادی کر سکتی ہیں۔ وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

پرتی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "دنیا والے ایسے بھی احمق نہیں ہیں جو بالکل ہی بوڑھا اور ناکارہ ہو گا۔ اس سے شادی کے بعد کوئی ماں کیسے بن سکے گی۔"

"اں۔ یہ دنیا والے سوچ سکتے ہیں۔" وہ صوف پر بیٹھ کر بولی۔ "پھر کیا کیا جائے؟ اچھا کسی ایسے شخص سے شادی کریں جو سخت تیار ہو اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ ہو۔"

پرتی نے پوچھا۔ "ایسا شخص اپنی زندگی کی فکر میں ہو گا جس کی بغیر ڈوب رہی ہو۔ وہ گلن منڈپ میں سات پھیرے بھی نہیں لگا سکے گا۔ پٹ سے گر کے مر جائے گا۔ تم تو مجھ سے بھی زیادہ بے تحاشے انداز میں سوچ رہی ہو۔"

لیڈی ڈاکٹر اچانک صوف سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ خوش ہو کر بولی۔ "آگلی تدبیر۔ فرسٹ کلاس تدبیر ہے۔ آپ پھر شریں..... آپ جانتی ہوں گی کہ ہلنے دو ہلنے کے

اندھرتے مجرم پھانسی پانے والے ہیں۔ بس کسی ایک پھانسی پانے والے سے شادی کر لیں۔ وہ شوہر بنے رہنے کے لئے زندہ نہیں رہے گا۔"

پرتی نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر ہزاری سے کہا۔ "ڈاکٹر شیل! بھگوان کے لئے مجھے گڑھے میں گرنے کا مشورہ نہ دو۔ اول تو ایک پھانسی پانے والے سے ہونے والی شادی معصومہ خیر بن جائے گی۔ پھر یہ کہ میں اپنے بچے کو کیا قاتل باپ کا نام دوں گی؟ نہیں کبھی نہیں۔"

ڈاکٹر شیل نے ایک مہری سانس لے کر کہا۔ "پرتی جی! ایسے ہی لوگوں کے متعلق سوچا جاسکتا ہے۔ کیونکہ کوئی خریف آدمی ناجائز بچے کا باپ بنایا آپ کا دکھاوے کا شوہر بننا پسند نہیں کرے گا۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ڈاکٹر شیل نے فون کے پاس جا کر ریسیور اٹھایا پھر کسی سے باتیں کرنے لگی۔ پرتی سوچ میں ڈوب گئی۔ اب اس کے ساتھ یہ ہو رہا تھا کہ وہ بچے کا مسئلہ حل کرنے کے لئے جب بھی سوچنا شروع کرتی تو بچے لگا ہوں کے سامنے آکر مسکراتے گھٹا۔ پہلے وہ مسکراتا تھا تو پرتی کے لبوں پر بھی بے اختیار مسکراہٹ آجاتی تھی۔ پھر وہ چونک کر اس پاس دیکھنے لگی تھی کہ کوئی اسے تنہائی میں خواہ مخواہ مسکراتے ہوئے تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ اب وہ تصور میں آکر مسکراتا تو بے اختیار آنکھوں میں آنسو آنے لگتے۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے ٹیلی فون کی طرف دیکھا کہ کہیں ڈاکٹر شیل نے اس کی آنکھوں میں آنسو تو نہیں دیکھ لئے۔

ڈاکٹر شیل فون پر باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ پتہ نہیں اس کی گفتگو کے دوران کون سا ایسا لفظ آیا کہ پرتی کو اس لفظ کے حوالے سے ایک مقدمہ یاد آگیا۔ وہ ایک جوان عورت کا مقدمہ تھا۔ عورت اپنے شوہر سے طلاق لینا چاہتی تھی اور شوہر اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا۔ آخر عورت نے بھری عدالت میں کہہ دیا تھا کہ وہ شوہر بننے کے قاتل نہیں ہے۔

مرد کی گردن شرم سے جھک گئی تھی۔ اس کے وکیل نے کہا کہ عورت جھوٹ کہتی ہے میرے موکل کا طبی معائنہ کرایا جاسکتا ہے وکیل کے اس دعوے پر وہ شخص پریٹن ہو گیا تھا اور اس نے طبی معائنہ کرائے سے انکار کر دیا تھا۔ اس مقدمہ کی تفصیل یاد آتے

پریتی نے دل میں کہہ آہ! میں اپنی محبت کو رسوائی سے بچا رہی ہوں اور یہ غیروں کی طرح احسان مان رہے ہیں۔ اب! یہ مرد کتنی جلدی پر اسے بن کر پونے لگتے ہیں۔“ وہ زبان سے کچھ نہ بولی۔ دی بول رہا تھا۔ ”میں جانتی ہوں تم کیسے فولادی ارادے کی مالک ہو۔ اس بچے کو سلامت رکھو گی۔ اگر تم میری ایک تجویز مان لو تو میں تم اور نرملہ تینوں مل کر اس بچے کی پرورش کریں گے۔ یو لو میری تجویز مان لو گی؟“

بڑی دیر بعد وہ بولی۔ ”میں نے کہا تھا کہ آئندہ آپ اپنی آواز نہیں سنائیں گے۔“

”میں تمہیں مخاطب کرنے پر مجبور ہوں۔ سنو! میں نے اور نرملہ نے بڑی اچھی پلاننگ کی ہے اگر تم ایک سال کے لئے یہ شہر چھوڑ دو تو نرملہ اور ایک علاقہ میں تمہاری رہائش کا انتظام کر دے گی۔ پھر وہ خود اپنی زندگی کے وقت تمہارے پاس آجائے گی۔ اس کے حساب سے وہ تین ہفتے کے وقفے سے تم اور نرملہ بچوں کو ختم ہو گی پھر وہاں سے ہم اپنے رشتے داروں کو اطلاع بھیجیں گے کہ نرملہ نے وہ بچوں کو ختم دیا ہے۔“

”اور اس طرح وہ میرے بچے کو بھی لے کر چلی جائیں گی؟“

”ہاں۔ اس طرح تمہارا لانا ہے۔ ایک تو اس بچے کو میرا نام مل جائے گا۔ دوسرے تم بدنامی سے بچ جاؤ گی۔“

”اور آپ کے خیال میں سارے مسائل حل ہو جائیں گے؟“

”ہاں پریتی! تم خود فور کر دو۔“

”آپ غور کریں۔ آپ نے میرے خوابوں کی تعبیر چھین لی۔ میرا اچھوتا پین چھین لیا۔ اب میرے بچے کو بھی چھین کر نرملہ دیوی کی گود میں پھنسا دیا ہے۔ میرے پاس ایک جان رہ گئی ہے اسے کیوں نہیں لے لیتے۔“

”پریتی میں تمہاری عزت کی خاطر.....“

”میری عزت ہے کہاں؟ آپ نے تو اس کی دھجیاں اڑا دیں۔ آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو میری عزت کی خاطر نہیں محبت کی خاطر کریں۔ اپنے ضمیر سے پوچھیں کہ محبت میں جو قربانیاں میں نے دی ہیں۔ کیا آپ دے سکتے ہیں؟ میں مانتی ہوں کہ آپ ذہین سیاست دان ہیں مگر میرے بچے کو مجھ سے چھین لینے کی سیاست پر عمل نہ کریں۔ آپ کو دیوی ہو گی۔“

ہی پریتی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ڈاکٹر شیلانے بات ختم کرنے کے بعد ریسیور کو رکھتے ہوئے کہہ ”بٹھئے کہاں جا رہی ہیں؟“

پریتی نے اسے اس مقدمہ کی روداد سنانے کے بعد کہہ ”مجھے اس شخص سے شادی کرنا چاہیے۔“

ڈاکٹر شیلانے تہنید کرتے ہوئے کہہ ”ہاں۔ اگر وہ دوبارہ شادی کے لئے راضی ہو جائے تو شوہر کے بجائے سیلی بن کر رہے گا۔“

”شیلان! میرے ساتھ ابھی دفتر چلو۔ وہاں کسی فائل میں اس شخص کا پتہ موجود ہے۔ مجھے یاد آیا اس کا نام راجیش ہے۔ تم چاہو تو اسے شادی کے لئے راضی کر سکتی ہو۔ ٹھیک اسے یہ نہ معلوم ہو کہ یہ پیش کش میری طرف سے ہے۔“

”پریتی جی! میں اتنی نادان نہیں ہوں۔ یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں اسے انوکھا کر آپ کے ساتھ سات پھیرے لگوا دوں گی۔“

ان دونوں نے اسی وقت دفتر جاکر راجیش کا پتہ نوٹ کیا پھر ڈاکٹر شیلانے کہہ ”آپ یہیں دفتر میں بیٹھیں۔ میں راجیش کے پاس جا رہی ہوں۔ کہیں سے فون کر کے بتاؤں گی کہ اس کے ساتھ میری ملاقات کیسی رہی۔“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ پریتی اپنے دفتر میں بیٹھ کر ٹیلی فون کی طرف حسرت سے دیکھنے لگی کیونکہ اسی ٹیلی فون پر بٹھے سے باتیں ہوتی تھیں اور اس سے ملاقات کا وقت اور مقام مقرر ہوا کرتا تھا۔ جب گفتگو ختم ہو جاتی تو وہ رابطہ ختم کرنے سے پہلے ادھر سے ریسیور کو چومتا۔ ادھر یہ شرابا جاتی۔

وہ سوچتے سوچتے سب کچھ بھول کر شرابے لگی۔ اچانک ہی فون کی گھنٹی نے چونکا دیا۔ وہ گھبرا کر آس پاس دیکھنے لگی۔ کسی نے اسے شرابے تو نہیں دیکھا ہے؟ نہیں دفتر میں کوئی نہ تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہہ ”ہیلو!“

دوسری طرف سے بچے کی آواز سننے ہی کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ریسیور ہاتھ سے چھونٹنے ہی والا تھا مگر وہ سنبھل گئی۔ ریسیور سے آواز آرہی تھی۔ ”پریتی! یہ تم ہو؟“

وہ چپ رہی۔ اس نے التجا کی۔ ”یو لو پریتی! میں تمہارے لئے فکر مند ہوں۔ تم نے مجھے بدنام نہ کر کے جو احسان کیا ہے۔ اس کے آگے میری گردن جھک گئی ہے۔“

انہوں نے آپ کو چاہتا ہے۔ سچ بولتی ہوں! ایک دم ہانس کی طرح سیدھا ہے۔ بڑی جلدی شیشے میں اتر جائے گا۔ بس اب آپ آئیں گی تو باتیں ہوں گی۔“

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ راجیش کے متعلق سوچنے لگی۔ ”کیا وہ اتنی جلدی شادی کے لئے راضی ہو جائے گا؟ وہ تو کہے گا اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ چار چھ ماہ بعد دھوم دھام سے شادی ہو سکتی ہے۔ پھر میں کیا کہہ سکوں گی؟“

ایک محفل بعد اس نے ڈاکٹر شیلہ کے ہاں پہنچ کر اس سے یہی سوال کیا۔ شیلہ نے جواب دیا۔ ”پرہیز! میں نے راجیش سے پوچھا تھا کہ کورٹ میں طلاق ہونے کے بعد اس نے دوسری شادی کیوں نہیں کی؟ اس نے جواب دیا کہ اس طلاق کے مقدمہ کے بعد اس کی بڑی بدنامی ہوئی ہے۔ اس کی برادری اور چہن چہان والوں میں کوئی اسے لڑکی نہیں دیتا ہے۔“

پرتی نے پوچھا۔ ”جب وہ شادی کے قابل نہیں ہے تو شادی کیوں کرنا چاہتا ہے؟“
 ”اپنا مجرم رکھنے کے لئے۔“ شیلانے تلخی سے کہا۔ ”یہ دنیا اوپر سے ڈھول ہے۔
 اندر سے پول ہے میرے پاس ایسے کھوکھلے مریض علاج کے لئے آتے ہیں جو اوپر سے
 بالکل نارمل اور صحت مند نظر آتے ہیں اور رازداری کے سلسلہ میں بیماری فیس ادا کرتے
 ہیں۔ میں آپ کو مشورہ دیتی ہوں کہ راجش سے شرابے یا جھپکنے کی ضرورت نہیں ہے۔
 آپ آج ہی اپنی شرائط پر شادی کی بات چیت فرمیں۔“

”ہیں۔ تمہیں اپنی زبان سے اپنی شادی کی بات کیسے کر سکتی ہوں؟“

”کیوں نہیں کر سکتیں۔ بھی وہاں شرمایا جاتا ہے جہاں سچ مچ کسی کو شوہر ملتا ہو۔“

”ہے۔ وہ تو ایک ڈی ہوگ اپنی پھلی بھول کو چھپانے کے لئے وہ ایک پردہ ہوگ پردے سے کیا پردہ کرتا؟“

”تم ٹھیک کتنی ہو مگر یہ عجیب سا لگتا ہے میری ہمت نہیں پڑے گی۔“
 ”پر جی جی! اگر آپ نے ہمت نہ کی اور راجش ہاتھ سے نکل گیا تو اپنے بچے کو جائز
 بنانے کے لئے ایسا آدمی کیس نہیں لے گا۔ سوچ لیں ابھی وقت ہے۔“

سبھائی رہی کہ عورت 'مرد' سے بے دھڑک باتیں کر لیتی ہے۔ وہ بھی تو ایک سہیلی جیسے

ہوگ بھلا اس سے کیا شراب؟

جب وہ رات کو کھانے پر آیا تو پریتی اسے دیکھتے ہی ذرا محروم ہوگئی کیونکہ وہ ایک قد آور، صحت مند اور خورید جوان تھا۔ چونکہ مرد تھا اس لئے صنف مختلف کو متاثر کرنے والا مرد ہی نظر آ رہا تھا۔ خواہ وہ حقیقتاً کتنا ہی کھوکھلا کیوں نہ ہو۔ ڈاکٹر شیلانے دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا۔ پھر انہیں ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

راجیش نے پوچھا۔ "شریستی جی! آپ نے مجھے پہچانا؟ میں دی راجیش ہوں جس کی سہیلہ بیوی اردنا کی وکالت آپ نے کی تھی اور میری مخالفت میں آپ وہ مقدمہ لڑتی رہی تھیں۔ آخر طلاق ہو ہی گئی۔"

"مجھے یاد ہے۔ اس ایک سال میں آپ کافی بدل گئے ہیں۔ اچھے صحت مند ہو گئے ہیں۔"

پریتی نے موضوع بدلنا چاہا مگر راجیش نے کہا۔ "عدالت میں اردنا نے جو بیان دیا تھا اس سے میری بڑی بدنامی ہوئی۔ میرا کیئر بڑا ہو گیا۔"

"آپ مرد ہیں۔ پھر سے اپنا کیئر بڑا سکتے ہیں۔ آپ شادی کر لیں۔ سادی بدنامی دھل جائے گی۔"

"اب مجھ سے کوئی شادی نہیں کرے گی۔"

"آپ خورید اور اسلٹ ہیں۔ کوئی شادی کیوں نہیں کرے گی؟"

اس سوال پر وہ ذرا ہنسیکھایا پھر ہنچکتے ہوئے بولا۔ "کیا آپ سے شادی کی درخواست کر سکتا ہوں؟"

"آں۔ سمجھ سے؟"

پہلے پریتی کے لئے یہ مسئلہ تھا کہ خود ہی شادی کی بات کیسے چھیڑے؟ اب راجیش نے خود ہی بات چھیڑ دی تو وہ بے اختیار جھینپنے لگی۔ آخر عورت تھی۔

"جی ہاں۔" راجیش نے کہا۔ "دیکھئے! ابھی آپ نے اپنی زبان سے میری تعریف کی ہے کہ میں خورید اور اسلٹ ہوں۔ جب میں اتنا اچھا ہوں تو آپ کو انکار نہیں ہونا چاہئے۔"

اس نے بے اختیار اپنے سر پر آٹھل رکھ لیا۔ پھر سوچتے لگی۔ "یہ کیا حالات ہے؟ میں کیوں شراب پی رہی ہوں۔ اس سے کوئی شرابے کا رشتہ تو نہیں ہے۔ اگر رشتہ ہو گا تب بھی وہ شوہر نہیں مصل ایک سائن بورڈ ہوگا۔"

وہ بولا۔ "شاید آپ سوچ رہی ہوں گی کہ پہلی ہی ملاقات میں شادی کی بات نہیں ہوتی۔ مانا ہوں کہ ایسا نہیں ہوتا لیکن میرے حالات میں ایسا ہونا تعجب کی بات نہیں ہے جس نے بھی میرے سامنے وہ سری شادی کا ذکر چھیڑا میں نے اس سے یہی کہا کہ مجھ سے شادی کرلو۔ یا کہیں کراؤ اور آپ کی بات تو سب سے مختلف ہے۔ پہلی بار عدالت میں آپ کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا پشیمیری بیوی اردنا کی جگہ آپ ہونگی۔"

"آپ نے ایسا کیوں سوچا تھا؟"

"مجھے آپ کے چہرے سے آپ کے دل کی گہرائی کا اندازہ ہوا تھا۔ آپ کی حسرت اور صلاحیتوں نے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ آپ صحت گہری ہیں۔ میں ایسا عورت کو پسند کرتا ہوں جو اپنے مرد کے راز کو راز رکھے۔ اردنا کی طرح بھری عدالت میں کچھ نہ اچھالے۔"

پریتی نے اپنے یقین کے لئے پوچھا۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ میں آپ کے راز کو پیشہ چھپا کر رکھوں گی؟"

"ہاں ہمارے دس میں آپ بھی عورتیں زیادہ ہیں جو خود پر الزام لے لیتی ہیں مگر اپنے مرد پر الزام نہیں آتے دیکھئے۔"

وہ چونک کر راجیش کو دیکھنے لگی۔ کیونکہ اس نے اتنی ہی بات میں پریتی کے کردار کی خصوصیات پیش کر دی تھیں۔ اس نے غصے پر الزام نہیں آئے دیا تھا۔ پریتی کو شبہ ہوا کہ راجیش کو اس کے اور غصے کے تعلقات کا علم ہے؟ کیا وہ بچے کے بارے میں جانتا ہے؟

راجیش کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس نے اندازے سے یہ بات کہہ دی تھی۔ ڈاکٹر شیلانے ذکر کیا۔ "کھانا تیار ہے۔ آپ دونوں میز پر آجائیں۔"

وہ تینوں ڈرائنگ روم میں آکر میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ راجیش نے کھانا شروع کرتے ہوئے شیلانے کہا۔ "ڈاکٹر! میں نے پریتی جی سے شادی کی درخواست کی ہے۔ کیا

بند ہونے کی آواز سنائی دی تھی پھر قالین پر قدموں کا بھاری پن محسوس ہوا۔ اس نے اندازہ کیا کہ وہ جیسے آکر کھڑا ہو گیا ہے۔

”پریتی!“ اس نے پیار بھری سرگوشی میں پکارا۔

وہ چپ رہی۔ جیسے پھر کی ہو گئی ہو۔ راجیش کھڑکی کے پاس آکر اس کے برابر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ”شاید گھونگھٹ میں تمہیں گھٹن سی ہو رہی تھی۔ اس لئے یہاں آ گئیں۔“

”نہیں۔“ وہ بڑی آہستگی سے بولی۔ ”مجھ پر گھونگھٹ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے خود ہی اٹھا دیا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”دعی کہہ رہی ہوں۔ جو ہمارے رشتے کا تقاضا ہے۔“ وہ پلٹ کر کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی۔ اس کی طرف سے منہ پھیر کر بولی۔ ”ارونا نے بھری عدالت میں تمہارا..... مذاق اڑایا تھا۔ اس کے بعد تمہیں کہیں رشتہ نہیں ملتا تھا۔ میں نے تم سے شادی کر کے تمہارا بھرم رکھ لیا۔ تم بھی اسے اچھی طرح سمجھتے ہو کہ ہمارے درمیان صرف بھرم رکھنے والا رشتہ ہے۔“

”بھرم رکھنے والا رشتہ؟“ راجیش نے پہلے تو حیرانی سے پوچھا۔ پھر کہا۔ ”اوہ سمجھا تم نے دنیا والوں کے سامنے ارونا کی بات کو جھوٹ ثابت کرنے کے لئے دوسرے لفظوں میں میرا بھرم رکھنے میری عزت رکھنے کے لئے مجھ سے شادی کی ہے۔“

”ہاں یہی بات ہے۔“

”اوہ پریتی! پھر تو تم عظیم ہو۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ ایسے آدمی سے شادی کر کے ساری زندگی خواہشوں کی آگ میں جلتی رہو گی۔ تم نے انسانی ہمدردی کی بہت بڑی مثال پیش کی ہے۔ تمہاری جتنی بھی عزت کی جائے وہ کم ہے۔“

پریتی تھکے ہوئے انداز میں سچ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ وہ مطمئن تھی کہ وہ سماج کی سچ نہیں ایک اسٹیج ہے، جہاں وہ دونوں جھوٹ موٹ میاں بیوی کا رول ادا کریں گے اور ایک نئی کے..... دو کنارے بن کر زندگی گزاریں گے۔

وہ قریب آتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اب تم میری دھرم بھتیجی بنی ہو۔ اس لئے سچ بتا

دوں کہ ارونا نے عدالت میں جھوٹ کہا تھا۔“

پریتی نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا مطلب؟“ وہ بھلا جھوٹ کیسے کہہ دیتی اور اگر کہا تھا تو تم نے اتنے بڑے جھوٹ کو کیسے تسلیم کر لیا تھا؟“

وہ ہنسنے کے کنارے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”مجبوری تھی۔“

وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بے چینی سے پوچھا۔ ”ایسی بھی کیا مجبوری تھی کہ تم نے مرد ہو کر اس کا اتنا بڑا الزام اپنے سر لے لیا؟“

”پریتی! میرے پاس بیٹھو۔ تم میری بیوی ہو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔“

”نہیں پہلے بتاؤ۔ یہ کیسا بھیانک مذاق ہے۔ کیا عدالت میں وہ مقدمہ ہانسی بھی ایک مذاق تھی؟“

”نہیں۔“ وہ سچ سچ طلاق لینا چاہتی تھی اور اس نے لے لی۔ میں اسے بہت چاہتا تھا۔ میرے ماما پتا بھی کہتے تھے کہ..... سو خاندان کی عزت ہے۔ طلاق لے گی تو بڑی بدنامی ہوگی لیکن وہ بلا تھی۔ مقدمہ شروع ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ ایک امیر زادے کی محبت میں گرفتار ہے اور مجھ سے نجات حاصل کر کے اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“

اس نے بیچ پر پڑے ہوئے ایک پھول کو اٹھا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دنیا والوں کی موجودگی میں قانونی شادی کے باوجود مرد عورت کا رشتہ پائیدار نہیں ہوتا۔ عورت پرانے مرد کی طرف اور مرد پرانے عورت کی طرف بھاگ جاتے ہیں۔ ارونا کو بھانپنے والے پر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے اس امیر زادے کے پاس پہنچ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”کیونے! تو میرے گھر میں آگ لگا رہا ہے۔ ہمارے خاندان میں کبھی کسی نے کسی کو طلاق نہیں دی اور تو ذلیل کیونے.....“

میں اسے بے تحاشا گلے دینے لگا۔ اتنے میں ارونا وہاں پہنچ گئی۔ اس نے اپنے پریمی کی حمایت میں کہا۔ ”جب بات عدالت تک پہنچ گئی ہے تو تم ہماری محبت پر اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہو؟“

اس کے پریمی نے کہا۔ ”ارونا! اس نے مجھے گلے دی ہیں۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو تو میرے سامنے ایسی گلےاں دو کہ یہ ساری زندگی یاد کر سکے۔ تم اسے جھوٹ دو گی تو میں طلاق کے بعد تم سے شادی نہیں کروں گا۔“

ارونا نے غرت سے کہہ "میں کل عدالت میں اسے بتاؤں گی۔ اس نے صرف تمہاری نہیں ہماری محبت کی بھی توہین کی ہے۔ تم جلاؤ میں راجیش سے ایک آخری فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ اپنی کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ارونا نے اپنے پرس سے ایک کانڈ نکال کر مجھے پڑھنے کو دیا۔ وہ ایک محبت نامہ تھا اور اسے میری چھوٹی بہن نے اپنے محبوب کے نام لکھا تھا۔ اسے پڑھ کر معلوم ہوا کہ ہمارے خاندان کی عزت ملی میں ملے والی ہے۔ میری بہن بدنامی کی حد تک حشر میں مبتلا ہو گئی تھی۔

ارونا نے کہہ "تمہاری بہن میری سہیلی بنی رہی۔ میں اسے بدنام نہیں کروں گی۔ اس کے کہنے ہوئے تمام خطوط واپس کروں گی لیکن شرط یہ ہے کہ تمہیں عدالت میں میری گالی سن کر اسے تسلیم کرنا ہو گا۔ نہیں کرو گے تو تمہاری بہن کو پورے خاندان کے لئے ایک بدترین گالی بنا دوں گی۔"

وہ چلی گئی۔ پرتی تم اس کی وکالت کر رہی تھیں۔ تم نے بھی دیکھا کہ اس نے مجھے کیسی گالی دی۔ میں مجبور تھا۔ میں نے گالی کو برداشت کرتے ہوئے طبی معائنے سے انکار کر دیا۔ ارونا اپنی زبان کی دھمکی نکل۔ طلاق کے بعد اس نے میری بہن کے کہنے ہوئے تمام خطوط واپس کر دیئے۔ ان خطوط کو جلا کر ہم نے دہلہ کے اندر ہی بہن کی شادی کر دی۔ ہمارا خاندان بدنامی سے بچ گیا لیکن میں آج تک بدنام ہوتا آیا ہوں۔ پرتی! اب تمہیں پالینے کے بعد یہ بدنامی بھی دھل جائے گی۔"

پرتی دو قدم دور ہٹ گئی۔ حیرانی اور پریشانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راجیش کو دیکھنے لگی۔ اس نے کیا سمجھا تھا اور کیا لکھا؟ کیا ہماری دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی بہن کے لئے اپنے خاندان کے لئے دعا بننے کے لئے بظاہر گل بن جاتے ہیں۔

راجیش عظیم قد آور اور قابل پرستش مرد تھا کوئی رشتہ نہ ہوتا تو پرتی اس کی پوجا کرتی مگر رشتہ ایسا ہو چکا تھا کہ اب وہ بدحواس ہو رہی تھی۔ اس نے سرکس کے بونگ ماسٹر کی طرح یہ سمجھ کر شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالا تھا کہ دانت نہیں ہوں گے مگر وہ دانت والا نکلا تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے پسینے میں نہا گئی۔

راجیش نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے تم بہت زیادہ پریشان نظر

آ رہی ہو؟ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم مجھ سے گھبرا رہی ہو، کترات رہی ہو۔"

"آہ۔ ہاں۔" وہ بڑی مشکل سے تھوک نکل کر بولی۔ "مہ۔ میں نے شادی کرنے کے لئے شادی نہیں کی ہے۔"

"اس کا مطلب کیا ہوا؟"

"وہ۔ میں نے سمجھا تھا کہ تمہیں اپنا بھرم رکھنے کے لئے ایک راہدار بیوی کی ضرورت ہے اور مجھے بھی ایک ساتھی کی ضرورت تھی جو صرف دکھلوے کا شوہر بن کر رہے۔ میں۔ میں بچ بچ کسی کی بھی بیوی بن کر نہیں رہ سکتی۔"

اب راجیش حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا "کیا تم نے مجھے ڈھال بنا کر رکھنے کے لئے شادی کی ہے؟"

پرتی نے ہاں کے انداز میں سر ہلا کر جھکا لیا۔ وہ بولا۔ "تم قانون داں ہو کر ایسا کر رہی ہو۔ میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ صرف ڈھال بنایا جاؤں۔"

وہ منہ پھیر کر بولی۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ جسے ڈھال بنا رہی ہوں۔ وہ نکووار ہے۔ یہ سب کچھ غلط قسمی میں ہوا ہے۔"

راجیش نے پوچھا "اب کیا ہو گا؟"

پرتی پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ راجیش پہلی بیوی کو طلاق دے چکا ہے۔ مجھے بھی شادی کی رات طلاق دے گا تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا اور میں ایسی کم ظرف نہیں ہو کہ اس کی مزید بدنامی کا سبب بن جاؤں۔ پھر یہ کہ مجھے اپنے بچے کی قانونی سلامتی چاہئے۔ میں کیا کروں؟ اسے چھوڑ کر اور کتنی شادیاں کروں؟ کیا تماشا بن جاؤں؟

اسے سوچ میں غرق ہوتے دیکھ کر راجیش نے پوچھا "کیا ارونا کی طرح تم بھی کسی سے محبت کرتی ہو؟"

وہ راجیش کو دیکھنے لگی۔ جواب دینے سے ہچکچانے لگی۔ ارونا نے بیوی بن کر دوسرے سے عشق کیا تھا۔ پرتی سوچنے لگی۔ "میں بھی بیوی بن کر دوسرے کے حشر میں مبتلا ہوں۔ یہ بات راجیش کا کیوبہ چھلنی کر دے گی۔ آخر یہ انسان ہے۔ کتنی بے وفائیاں برداشت کرے گا؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”نہیں۔ میں کسی سے محبت نہیں کرتی مگر مجھ سے ایک غلطی ہو چکی ہے۔“
”کیسی غلطی؟“

وہ ذرا چپ رہی لیکن چپ رہنے سے وہ لٹلی چھپ نہیں سکتی تھی۔ آج نہیں تو کل اسے ظاہر ہوتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بولی۔ ”میں۔ میں ملنا بننے والی ہوں۔“

راجش ایک قدم پیچھے ہٹنے کے وقت لڑکھڑایا اور گرتے گرتے بستر کے سرے پر بیٹھ گیا۔ تمام باتیں اس کی سمجھ میں آگئی تھیں کہ پریتی نے اسے وحال سمجھ کر کیوں قبول کیا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا اور وہ منہ چھپائے رو رہی تھی۔ آہ! وہ سماگ رات اپنے اعمال کے حساب کی رات بن گئی تھی۔

وہ دونوں بہت دیر تک خاموش رہے پھر وہ بولا۔ ”پریتی! بیٹھ جاؤ۔ تھک جاؤ گی۔ میں نے کہا تھا کہ شادی ایک جوا ہے۔ میاں بیوی کی زندگی گزارنے کے بعد ہار جیت کا پتہ چلتا ہے اور میں دوسری ہار ہار گیا۔“

وہ ایک صوفے پر سمٹ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں شرمندہ ہوں۔ میں نے تمہیں غلط سمجھا اور تمہارے لئے ایک مصیبت بن گئی۔ تم خاندانی لوگ ہو۔ میری بھی عزت اور شہرت ہے۔ طلاق ہم دونوں کے لئے بہت زیادہ بدنامی لائے گی۔“

”میں اردو نا کو طلاق نہیں دیتا چاہتا تھا۔ تمہیں بھی نہیں دوں گا۔ مجھ میں اب ذلت اور رسوائی برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہے اور اگر تم طلاق لینا چاہو گی تو میں خودکشی کر لوں گا۔“

”میں طلاق نہیں لوں گی مگر میرے بچے کا کیا ہو گا؟“

”تم طلاق نہیں لے کر مجھ پر احسان کرو گی۔ میں بچے کا باپ بن کر احسان کا بدلہ چکاؤں گا۔“

پریتی نے کہا۔ ”ہمارے درمیان یہ سمجھوتہ ایک راز بن کر رہے گا۔ کسی تیسرے کو اس کا علم نہیں ہو گا۔“

”تیسرے کو علم ہے۔“ راجش نے کہا۔ ”اور وہ تیسرا شخص بچے کا اصل باپ ہے۔“

جب ہم راز دار ہی ٹھہرے تو کیا تم اس شخص کا نام بتاؤ گی؟“
پریتی کی نگاہوں کے سامنے بچے مسکرانے لگے۔ ہائے وہ کیا شخص تھا۔ اپنی شخصیت کی چھاپ لگا کر اس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا لیکن میں اس کی عزت رکھوں گی۔

راجش نے اسے سوچتے دیکھ کر پوچھا۔ ”اگر تم نہیں بتاؤ گے تو میں نہ بتاؤں۔“
وہ بولی۔ ”اس کا نام لینے سے میرا دل دکھے گا اور تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا اور اس کی جھوٹی شرافت کا بھرم رہ جائے گا۔ راجش! کچھ ایسے مرد ہوتے ہیں جن کی عزت عورتوں کی عزت سے زیادہ ڈاک ہوئی ہے۔ نام لیتے ہی چکنا چور ہو جاتی ہے۔“

وہ بچے کو حضور میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیوں ٹھیک ہے نا؟“

راجش نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ اب میں نام نہیں پوچھوں گا۔“

اس وعدہ کے ساتھ وہ کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ اس کے اندر جو ایک آگ بجھنے والی تھی، اب وہ اور بھڑکنے لگی تھی۔ کھڑکی کے باہر سے آنے والی ٹھنڈی ہوائیں اسے بھجا نہیں سکتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ شراب کی بوتل کھول کر بیٹھ جائے پھر اس قدر پیتا رہے کہ سماگ رات کو بھول جائے اور شوہر بنا کر جذبات کا مذاق اڑانے والی اردو اور پرست صبح تک یاد نہ آئیں۔

لیکن وہ شادی کا گھر تھا۔ اگر وہ پینے کے بعد صبح دیر تک چڑا سوتا رہتا تو یہ بعید کھل جاتا کہ اس نے صرف شراب کی بوتل کے ساتھ رات گزاری ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سماگ کے اس قید خانہ سے کیسے باہر نکلے؟ باہر رشتے داروں کا چہرہ تھا اور اندر قیامت کی رات گزارنا تقریباً ناممکن تھا۔

وہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹھٹھٹے لگا۔ اس نے پریتی سے کہا کہ وہ سو جائے لیکن وہ صوفے پر سر جھکائے بیٹھی رہی اور راجش کی بے چینی کو سمجھتی رہی۔ اس بے چارے پر جو ظلم ہو رہا تھا۔ اس کی ذمہ دار خود کو سمجھتی رہی۔ اس نے اپنے دل میں جھانک کر دیکھا کہ وہ وہاں سے بچے کو ہٹا کر راجش کو بٹھا سکتی ہے یا نہیں؟ وہ راجش کو جگہ دے سکتی تھی لیکن بچے وہاں سے نہیں ہٹ رہا تھا۔ محبت کے گہرے نقش کو اتنی جلدی مٹانا آسان نہیں ہوتا۔ البتہ راجش کے متعلق بھی سوچنے اور ذرا متاثر ہوتے رہنے کے حالات پیدا ہو گئے تھے۔

کو ختم دینے آئی ہے تو اس خاندان کی کبھی بدنامی نہ ہوتی۔ ساری دنیا پریتی اور اس کے بچے پر تھوکتا شروع کر دیتی۔ یہ راجیش کی عظمت تھی کہ وہ بچے کی ذہنی بن گیا تھا اور اس نے اس کو اسے نیک نامی دے رہا تھا۔

وہ خود کو اس کے سامنے حقیر محسوس کر رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے راجیش نے اسے جوتی بنا کر پہن لیا ہے اور اب وہ اس کے پاؤں سے نہیں نکل سکے گی۔ ویسے اپنے بچے کی خاطر جوتی بن کر رہنا بھی منظور تھا۔ سسرال میں اس کے دن گزرنے لگے۔ شادی کے چار دن بعد ہی وہ دفتر میں بیٹھنے لگی۔ مقدمات پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینے لگی۔ راجیش شام کو کار نہیں آتا تھا اور اسے دفتر سے گھر لے جاتا تھا۔ وہ تو مصروفیات میں گزر ہی رہے تھے مگر راتیں ان دنوں کی جان لے لے کر گزرتی تھیں۔ کیونکہ ایک ہی کمرے میں وہ الگ الگ سوتے تھے۔ راجیش غم غلا کرنے کے لئے تھوڑی سی بی لیتا تھا۔ اسے نشہ میں نیند آ جاتی تھی۔ پریتی بھی آدمی رات کے بعد مطمئن ہو کر سو جاتی تھی۔

ایک ماہ کے اندر ہی سسرال والوں کو یہ خوشخبری ملی کہ وہ میں بننے والی ہے۔ اس اطلاع پر کئی من مٹھائیں تقسیم کی گئیں۔ ساس تو اپنی بہو پر قربان ہوئی جاری تھی۔ کمال راجیش کا تھا۔ اس نے اب تک بچے کے باپ کا نام نہیں پوچھا تھا اور اپنے آپ پر جبر سے سرتوں کا بھروسہ کر رہا تھا۔

چند ماہ اور گزر گئے۔ پریتی نے اپنے منوکوں کو دوسرے دیکلوں کے پاس بھیج دیا۔ کیونکہ وقت قریب آ رہا تھا اور وہ ایسی حالت میں نہ تو مقدمات پر توجہ دے سکتی تھی اور نہ ہی عدالت میں حاضر ہو سکتی تھی۔ ایک رات وہ اپنی خواب گاہ میں تھی اور راجیش بیٹھا بی رہا تھا۔ پریتی نے پوچھا۔ ”کیا تم شراب نہیں چھوڑ سکتے؟“

”کیا تم شراب بھی چھڑا جاتی ہو؟“

”ہاں یہ برائی کی طرف لے جاتی ہے۔ میں نے آج نہیں ایک سوسائٹی گرل کے ساتھ دیکھا ہے۔“

”تم نے آج دیکھا ہے۔ حالانکہ شادی کے دوسرے ہی دن سے یہ سلسلہ ہے۔ پہلے میں نے بھی کسی لڑکی سے دوستی نہیں کی۔ آج مجھ میں یہ برائی شراب نے پیدا نہیں کی۔ یہ دوسری شادی کا نتیجہ ہے۔“

آخر قیامت کے انتظار کے بعد صبح ہو گئی۔ راجیش کمرے سے باہر جانے لگا تو پریتی نے کہا۔ ”سنو! آج میں نے تمہاری شرافت دیکھی ہے۔ ہو سکے تو اپنا حوصلہ بھی دکھاؤ اور باہر جا کر ہنسنے بولتے رہو۔ ورنہ بھانڈا پھوٹ جائے گا۔“

اس نے کہا۔ ”اور نا کے دیئے ہوئے مقدمات ایسے تھے کہ میں دنیا والوں کے سامنے رو سکتا تھا آج سے تمہاری دی ہوئی زندگی کے مقدمات ایسے ہیں کہ میں رو بھی نہیں سکتا۔ اطمینان رکھو میں ہنستا رہوں گا۔ کسی کو شبہ نہیں ہو گا۔“

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ پریتی نے دروازے کو اندر سے بند کر کے سماگ کی سچ کی جانب دیکھا۔ اس سچ کو دیکھ کر بچے کا خیال آیا۔ ”میرے ملامت کی۔“ ”پریتی! تجھے شرم نہیں آتی۔ جو تجھے بدنامی کی دلیلیں چھوڑ کر گیا تو اس کا تصور کر رہی ہے اور جو تجھے نیک نامی کی سچ پر لایا تو اسے ساری رات تڑپاتی رہی۔ تیرے جیسی بے حس اور ظالم اور کوئی نہ ہوگی۔“

پریتی نے اس ملامت سے گھبرا کر بچے کو دماغ سے باہر جھٹک دیا۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سچ پر آئی۔ وہاں چادر بے شکن تھی۔ سسرال والے وہاں آکر دیکھتے تو شبہ کرتے۔ پریتی نے چادر کو ادھر ادھر سے کھینچ کر شکنیں پیدا کیں۔ اس پر بکھری ہوئی کلیوں اور پھولوں کو مسل مسل کر سہانے سے پالتی تک چھڑک دیا۔ دروازے کے پاس جا کر آہستگی سے چٹنی گرائی۔ پھر وہاں آکر سارے دیورات اتار کر کھانے کے نیچے رکھ دیئے۔ اس کے بعد گھونگھٹ سر پر ڈال کر سماگ کی سچ پر بیٹھ گئی۔

دو منٹ کے بعد ہی اس کی ساس، ندیں اور دوسری لڑکیاں ہنسی بولتی اس کمرے میں داخل ہونے لگیں۔ وہاں اب شبہ کرنے کے لئے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ندیں اپنی پریتی بھالی کو غسل کرانے لے گئیں۔ ڈیرہ گھنٹے بعد ناشتے کی میز پر دلہن کے ساتھ سسرال لوگ اور دوسرے رشتے دار موجود تھے۔ راجیش بچوں کو چھیڑ رہا تھا۔ بھابیوں سے مذاق کر رہا تھا اور پریتی کی تعریفیں کر رہا تھا۔

اور پریتی ندامت سے جھکی جا رہی تھی۔ راجیش یہ ناگہ کیوں کھیل رہا تھا؟ کیا اس لئے کہ وہ دوسری بیوی کو بھی طلاق دے کر اپنے خاندان کو بدنام نہیں کرنا چاہتا تھا؟ لیکن نہیں جب یہ ثابت ہو جاتا کہ پریتی نے باپ کیا ہے اور وہ اس خاندان میں ایک ناجائز بچے

پریتی کا سر جھک گیا۔ وہ بولا۔ ”میں تمہیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میرے پنے سے تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو یوں اور آزماؤ میں پتا بھی چھوڑ دوں گا۔“
وہ بدستور سر جھکائے ہوئے بولی۔ ”میرے بچے پر آپ کی پرورش کا اثر ہو گا۔ وہ آپ کو باپ سمجھتا رہے گا۔ آپ سے متاثر ہوتا رہے گا اور آپ ہی کی عادتیں سیکھتا رہے گا۔“

”ہاں میں سمجھ گیا۔ میرے نام سے پلٹے والا بچہ کوئی غلط کام نہیں کرے گا۔“
یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ۔ پھر اس نے بول اور گلاس کو اٹھا کر کھڑکی کی طرف پھینک دیا۔ ”یہ تو۔ آج سے کوئی مہی چھوڑ اس گھر میں داخل نہیں ہوگی۔“
راجیش کی اس حرکت نے پریتی کو اس قدر متاثر کیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس دوڑ کر جانا چاہتی تھی اور اس کے قدموں سے پلٹ کر اس کی عظمت کا اعتراف کرنا چاہتی تھی لیکن ٹھیک اسی وقت خواب گاہ کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک منہ کہہ رہی تھی۔ ”بھائی آپ کی ٹیلی فون کال ہے۔“

پریتی کو کسی ٹیلی فون کال سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ راجیش کے قدموں تک پہنچنے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ اتنے میں پھر منہ کی آواز آئی۔ ”فون کرنے والے صاحب کا نام بچے کمرتی ہے۔ کیا آپ بات کریں گی؟“

پریتی کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ راجیش کی طرف سے پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگتی ہوئی گئی۔ وہ سرے ہی لمحہ وہ دروازہ کھول کر تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ وہاں ٹیلی فون کے پاس ساس اور سر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بچاؤ کیا جانتے تھے کہ بہو کے لئے عشقیہ کال ہے۔ معزز گھرانوں میں ایسا سوچا بھی نہیں جاتا۔ اس لئے وہ دونوں بوڑھے وہاں بیٹھے رہے۔ پریتی نے ریسیور اٹھا کر دھڑکنے ہوئے دل سے ”ہیلو“ کہا۔

”ہیلو پریتی؟“ وہ سری طرف سے بچے کی آواز سنائی دی۔ ”شاید اب مجھے پریتی کہنے کا حق نہیں رہا۔ پہلے اگر سنا کہ تم مسز راجیش بن گئی ہو۔“
وہ کن انکھیوں سے ساس سر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ جیسے بڑے آدمی شادی

کی۔۔۔۔۔ (مبارک باد) دے رہے ہیں میں کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔“
”اس مبارکباد؟“ بچے نے حیرانی سے پوچھا۔ پھر کہا۔ ”اوہ سمجھا۔ ٹیلی فون کے پاس تمہارے شوہر اور سسرال والے بیٹھے ہیں۔“
وہ بولی۔ ”آپ سمجھ دار ہیں۔ ابھی میری شادی کو چند ماہ گزرے ہیں۔ میں کوئی کیس ہاتھ میں نہیں لوں گی۔“

”میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“
”میں اپنے گھر میں بیٹھ کر ٹیلی فون پر کسی کیس پر بات نہیں کر سکتی۔“
”تو باہر کہیں ملاقات کرنا۔“
”سوری۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“
”پھر میں تمہیں اور راجیش کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دوں گا۔“
”نرملادیوی کیسی ہیں؟“

”میں اسے دہلی میں چھوڑ کر آیا ہوں۔ وہ ذہنی تک وہیں رہے گی۔“
”پھر تو آپ کے ہاں دعوت مناسب نہیں رہے گی۔ ذرا ہولڈ آن کریں۔“
راجیش ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑا دور سے پریتی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ پریتی نے ریسیور کے ہاتھ نہیں پر ہاتھ رکھ کر راجیش کو دیکھا۔ پھر اپنی ساس کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”ماں جی! شاید آپ لوگوں نے سنا ہو گا۔ بچے کمرتی صاحبہ ایم پی ہیں ان کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ وہ میری شادی کی خوشی میں مجھے اور راجیش کو دعوت دینا چاہتے ہیں۔“

راجیش نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”جس نے تم پر احسانات کیے ہیں میں اس کی دعوت ضرور قبول کروں گا۔“
پریتی نے اس کی باتوں کے پیچھے ہلکے سے ہلکے محسوس کیا یا پھر اس کے دل میں چور تھا اس لئے وہ ایسا محسوس کر رہی تھی۔ وہ بولی۔ ”لیکن میں قبول نہیں کروں گی۔“

ساس نے پوچھا۔ ”کیوں بیٹی؟“
”ماں جی! کمرتی صاحبہ کی دھرم چٹی دہلی میں ہیں۔ وہاں دعوت قبول کرنا مناسب نہیں ہے۔ اگر آپ لوگوں کی اجازت ہو تو میں کمرتی صاحبہ کو کل یہاں کھانے پر

پریتی نے پوچھا۔ ”انصاف کیسے ہوگی؟“

بے فکر راجش مہبت کا حق دار تھا، لیکن بچے کے ساتھ مگزی ہوئی اندھی جوفانی کا ایک ایک لمحہ یاد آتا تھا۔ وہ شعوری طور پر بچے سے کترا رہی تھی مگر غیر شعوری طور پر خیال ہی خیال میں اپنے ایک ایک لمحہ کا حساب اس سے ہاتھ تھی۔ اس کے باوجود عقل سمجھاتی تھی کہ اب وہ کسی کی بیوی اور ایک شریف گھرانے کی بہو ہے۔ جہاں اس کے بچے کو تحفظ مل رہا ہے وہاں کے لوگوں سے بے ایمانی نہیں کرنا چاہیے۔ عقل یہی سمجھا کر اس کی خیمہ اڑا دیتی تھی۔

★ 中国书画函授大学 ★ 肇庆分校 ★

مجھے کبھی اپنے وعدے کے مطابق پرتی کے ہاں دعوت پر پہنچ گیا تھا۔ پرتی نے اپنے سسرال والوں سے اس کا تعارف کرایا۔ راجیش نے اس سے معاملہ کرتے ہوئے کہا: ”کبھی صاحب! آپ بڑے خوش نصیب ہیں۔“
مجھے نے پوچھا: ”تو کیسے؟“

”ایسے کہ میری و حرم چنی کل رات سے ہی آپ کے آنے کی اس مبارک گھڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ پرنتی جس کا انتظار کرے وہ بھاگوں کیا بھگوں بن جائے۔“

اس بات پر سب نے قہقہہ لگایا اور راجیش کی بات نہیں میں اڑ گئی۔ ویسے وہ برابر زعمہ دلی کا ثبوت دے رہا تھا۔ کھانے کے دوران بھی وہ پُر لطف باتیں کر کے سب کو ہنساتا رہا۔ پر جی جبراً اس دیتی تھی۔ یہ سچائی اسے کھلتی تھی کہ وہ کتنے سارے معاملات کے لاؤ میں جمل کر رہتا رہتا ہے۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلنے والا تھا۔ راجیش نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا: ”پرچی! تم جانتی ہو کہ اس وقت میں چائے نہیں پیتا میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں ہمارے بیڈ روم کے ساتھ والا کمرہ تمہارے اور مکی کی صاحب کے لئے مناسب رہے گا۔ وہاں کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ چائے اسی کمرے میں منگواؤ۔“

وہ ڈانٹنگ دوم سے نکل کر اپنے بیٹے دوم میں آگیا۔ کمرے کے اندر آکر اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ آج دن کو اس نے اپنی ہماری میں کپڑوں کے نیچے ایک اچیکر چھپایا تھا۔ برابر والے کمرے میں چھت سے جو فلتوں..... لٹک رہا تھا وہاں اس نے ایک مائیک رکھ دیا تھا اور اس کمرے کے سوئچ بورڈ کا کنکشن اپنے بیٹے دوم سے کر دیا۔

تھا۔ وہ اپنی کمر اٹھا کر سوچ بچوڑ کے نیچے میز کر پاس آیا اور اس کے تار کو سوچ بچوڑ سے نکلے ہوئے ایک تار سے منسلک کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اپنی کمر سے آوازیں آنے لگیں۔
براہِ والے کمرے میں فانوس کے نیچے ایک سینئر فیل تھا۔ اس کے اطراف صوفے تھے۔ سینئر فیل پر کبھی بیابیاں رکھنے اور کبھی پیالوں میں میج چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر پریقی کی آواز آئی۔ وہ لازم سے کہہ رہی تھی۔ ”تم جاؤ۔ دروازہ بند کر دینا۔ مجھے ضرورت ہوگی تو بلاؤں گی۔“

ذرا دیر بعد دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ ملازم چلا گیا تھا۔ اب وہ دونوں کمرے میں تھاتھے اور بالکل خاموش تھے۔ ٹافوس کے درمیان چھپا ہوا مائیک اتنا حساس تھا کہ ہلکی سی آہٹ کو بھی دوسری طرف نشر کر دیتا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ آخر پریقی نے پوچھا۔ ”آپ فون پر مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ اب خاموش کیوں ہیں؟“

مجھے نے کہا۔ ”میں کیا کروں؟ راجیش بہت ہی زخمی دل نظر آتا ہے۔ اس نے ہمیں
جیت لیا ہو گا۔ اب میرے کہنے کے لئے کیا رہ گیا ہے؟“

وہ بولے۔ ”راجیش انسان نہیں دیکھتا ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ بچہ ان کا نہیں ہے بلکہ بھی وہ باپ بن کر اس بچے کو سلامتی حقوق دیں گے۔“

”نہجے نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا راجیش کو تم نے دیکھا ہے کہ وہ کچھ میرا ہے۔۔۔“

”وہ بچہ آپ کا نہیں ہے۔“ پرتی نے سخت لہجے میں کہا۔ ”وہ صرف میرا ہے۔ اگر آپ کی دنیا میں بچوں کو ماؤں کے نام سے پکارا جاتا تو میں اس معصوم کو اپنا ہی نام دیتی کسی مرد کی محتاج نہ ہوتی۔ مرانی کر کے آپ کبھی اس بچے کا ذکر بھی اپنی زبان پر نہ لائیں۔“

”ٹھیک ہے میں اس کا ذکر کبھی نہیں کروں گا۔“

پریتی کا دل دیکھ لگے بچے کتنی جلدی اس بچے سے خود کو دور کر رہا تھا۔ کیا وہ نرمل سے ہونے والے بچے سے منہ پھیر سکتا تھا؟ نہیں اس کے لئے نرمل کا بچہ ہی سب کچھ تھا۔ ساج اور قانون کے کسی کہانے میں پریتی کے بچے کا نام نہیں آ سکتا تھا۔ پھر وہ بچے کے سامنے کیوں بیٹھی تھی؟ مجھ کا ظلم ٹوٹ چکا تھا۔ محبوب کا چہرہ دکھا ہو چکا تھا۔ اب وہ بچے سے کیا آس لگا رہی تھی؟

مجھے نے پوچھا۔ ”میں یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ اب بھی تمہارے دل میں میرے لئے کچھ جگہ ہے یا نہیں؟“

”آپ اپنے سوال کا جواب خود دیں۔ میرے دل میں کس کے لئے جگہ ہونا چاہئے۔ اس کے لئے جس نے مجھے ذلت کی پستی میں گرانا چاہا یا اس کے لئے جس نے مجھے گرنے سے پہلے ہی بچالیا؟ آپ بتائیں۔ کیا اب بھی آپ میرے دل میں رہنا چاہتے ہیں؟ لیکن کس منہ سے رہنا چاہتے ہیں؟“

”پریتی! تم جانتی ہو کہ میں کس قدر مجبور ہوں۔“

”میں یہ بھی جانتی ہوں کہ مجبور یوں سے گزرنے کا نام ہی آزمائش ہے اور آزمائش کے بغیر محبت نہیں ہوتی۔“

وہ ایک لمبی سانس پھوڑ کر بولا۔ ”مجھے صرف سیاستداں اور قانون داں ہونا چاہئے تھا لیکن تمہاری محبت کا روگ ایسا ہے کہ میرے دم تک اس کا علاج نہ تم سے ہو سکے گا نہ مجھ سے۔ یہ دل ایک ضدی بچے کی طرح صرف تمہارے لئے پھلتا ہے۔“

”آپ دل کو سمجھائیں کہ پریتی کو بچے کے ساتھ ہی حاصل کیا جاسکتا ہے تو عشق کا بخار لہڑا ہو جائے گا۔ مجھے صاحب! پریتی اب وہ الحز اور یوان لڑکی نہیں رہی جو آپ کی زبان سے محبت کا ایک لفظ سن کر اپنا سب کچھ ہار جاتی تھی۔ بڑے چر کے دیئے ہیں مجھے صاحب آپ نے بڑے چر کے دیئے ہیں۔“

”تم جتنی باتیں بھی سناؤ۔ وہ کم ہے۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔ جتنا بخار نکال سکتی ہو نکال لو۔“

وہ چند لمحوں تک چپ رہی۔ پھر بولی۔ ”میں کچھ باتیں دہراؤں گی تو وہ بخار نکالنا ہی کھلائے گا۔ کیوں نہ ابھی کی بات کی جائے؟“

”ہاں جو ہو چکا ہے اسے نظر انداز کر دینا دالٹل مندی ہے۔ یہ سمجھو کہ اب بھی میں دیوانہ وار تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”اور اب مجھے آپ سے شدید نفرت ہے۔“

”پریتی! یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

”نہیک کہہ رہی ہوں۔ اگر آپ کہتے کہ ابھی آپ مجھے میرے بچے کے ساتھ لینے

آئے ہیں تو میں خوشی سے مر جاتی مگر آپ کے دماغ کے کسی گوشہ میں وہ مظلوم بچہ نہیں ہے۔ صرف میری جوانی ہے میں ایسی ہوں پرستی پر لعنت بھیجتی ہوں۔ آپ کی شخصیت کا جو مینار میرے سامنے تعمیر ہوا تھا۔ وہ مگر چکا ہے۔ آج یہاں سے جانے کے بعد آپ یہ سوچ کر جائیں کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ آئندہ آپ فون پر بھی مجھ سے بات نہیں کریں گے۔“

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مجھے آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ”اگر یہ ہوس پرستی ہوتی تو کیسے بھی پوری ہوتی رہتی۔ صرف تمہاری آرزو نہ ہوتی۔“

”یہ کیسی آرزو ہے کہ آپ ایک بیاتہ عورت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ اخلاقی پستی نہیں ہے؟ میں راجیش کا احکم ہوں۔ ان کے گھرانے کی عزت ہوں۔ میں مر جاؤں گی مگر کبھی اس خاندان کی بدنامی کا سبب نہیں بنوں گی۔“

”اگر یہ عزت ہے تو پھر کیوں رو رہی ہو؟“

”اس بات پر رو رہی ہوں کہ آپ کی محبت نے مجھے کس قدر کمزور بنا دیا ہے۔ میں اس کمزوری پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ آپ سے الٹھا کرتی ہوں کہ میری بات مان لیں۔ آئندہ کبھی ملاقات نہ کریں۔ کبھی اپنی آواز نہ سنائیں۔ عورت ہی کو بدنام رہنے دیں کہ اس نے آدم کو جنت سے نکالا تھا۔ آپ مجھے اس شریف گھرانے کی جنت سے نکال کر یہ اعزاز حاصل نہ کریں۔“

”ایسی بات ہے اگر تم مجھے دیکھ کر میری آواز سن کر ہلک جاتی ہو تو میں نہیں بہکاؤں گا۔ آنسو پونچھ لو۔ ہاتھ روم میں جا کر منہ دھو لو۔ ورنہ..... گھر واسے کیا سوچیں گے؟“

خاموشی چھا گئی۔ پریتی نے کچھ نہیں کہا۔ شاید ہاتھ روم میں چل گئی تھی کیونکہ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ راجیش خوش ہو گیا تھا۔ پریتی کی باتیں سن کر اس کے چہرے پر ناؤ کی آگئی تھی۔ بلاشبہ اس عورت نے بہت ہی اچھے کردار کا ثبوت دیا تھا۔ راجیش اسٹیکر کے کنکشن کو الگ کر کے اسے دوبارہ الماری میں رکھنے کے بعد اپنی خواب گاہ سے باہر آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد پریتی بھی تھوڑی دیر بعد آئی۔ ساتھ دوسرے کمرے سے باہر آئی۔ راجیش ان

دونوں کے ساتھ کوٹھی کے باہر آیا۔ پھر بچے نے رخصتی مصافحہ کیا۔ وہ اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ راجیش نے کہا: ”مکرتی صاحبہ اچھے آدمی ہیں۔ کیا کیس کے سلسلے میں باتیں ہو گئیں؟“

پرتی نے اسے دیکھا پھر نظریں جھکا کر بولی۔ ”جی ہاں۔ بڑا الجھا ہوا کیس تھا میں نے مشورے دیئے ہیں۔ ان پر عمل کریں گے تو الجھنیں دور ہو جائیں گی۔“

”میری دعا ہے کہ الجھنیں دور ہو جائیں۔ آؤ اپنے کمرے میں چلیں۔“ وہ جانے کے لئے محووم گیا۔ پرتی نے کہا: ”سنو!“ وہ رک گیا۔ اسے دیکھنے لگا۔ پرتی نے بڑے پیار سے پوچھا: ”تم مجھ پر بھروسہ کیوں کرتے ہو؟“

”انسان ایک دوسرے پر بھروسہ نہ کرے تو یہ دنیا نہ چلے۔ لوگ ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے پر مجبور ہیں۔“

”میں تمہاری بات پوچھ رہی ہوں۔“

”پرتی! تم عدالتوں میں قانون کے سارے جھوٹ کو جھوٹ اور سچ کو سچ ثابت کرتی ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی سب سے بڑی عدالت ضمیر کی عدالت ہوتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم اپنے دل کی عدالت میں اپنا مقدمہ آپ لڑتی رہتی ہو۔ اسی لئے میں بڑے صبر سے بھروسہ کر رہا ہوں۔“

پرتی نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ پھر کوٹھی کے اندر جانے سے پہلے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ راجیش نے حیرت سے اور مسرت سے اس ہاتھ کو دیکھا۔ کیونکہ آج تک اس نے اسے اپنا ہاتھ پکڑنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اب چاہتی تھی کہ وہ اسے چھو لے۔ راجیش نے بڑے پیار سے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ پھر وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے شانہ بشانہ کوٹھی کے اندر چلے گئے۔

☆-----☆-----☆

بچے نے پھر کبھی کسی طرح بھی پرتی سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ ماہ دو ماہ چار ماہ گزر گئے۔ ان کی محبت ماضی کا شائد بن کر رہ گئی۔ تعلقات بیٹھ کے لئے ختم ہو گئے۔ پرتی رفتہ رفتہ راجیش پر توجہ دے رہی تھی۔ ایک وفا شعار بیوی کی طرح تن من سے اس کی خدمت کرتی تھی اور اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھتی تھی۔ پھر اس کی زندگی

میں وہ وقت آ گیا۔ جب اس نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا۔

راجیش نے اس بچے کو اپنے سے لگا کر کہا: ”تقدیر نے اس بچے کے ہمارے تمہیں میری بیوی بنادیا۔ بیوی بننے کے بعد بھی پہلے تم مجھ سے دور دور رہتی تھیں لیکن تمہارے دل کی عدالت میں میں مقدمہ جیتنے والا ہوں۔ پہلے تم نے اپنا ہاتھ مجھے دیا، پھر توجہ دینے لگیں۔ اس کے بعد خدمت گزاری میں لگ گئیں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اگلے ایک دو سال میں تم میرے بچے کو جنم دو گی۔“

پرتی نے اپنا ہاتھ چہرے پر رکھ کر اپنے تاثرات چھپا لئے۔ راجیش نے کہا: ”اس بچے نے ہمیں ملایا ہے۔ ہمارے رشتے کو امر (داعی) کیا ہے۔ ہمیں پیار کے حکم پر پہنچایا ہے۔ میں اس کا نام امر سنگھ رکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”بہت ہی خوبصورت نام ہے۔“ پرتی نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا لیا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کا ہلکا سا سیلابی جھلک رہا تھا۔ اس ہانی کو آنسو نہیں کہہ سکتے کیونکہ آنسو غم اور صدمات کی علامت ہوتے ہیں اور آنکھوں کا پانی حیا کی علامت ہوتا ہے اور ابھی پرتی کی آنکھوں کا پانی نہیں مرا تھا۔

امر کے جنم پر اس کے سسرال میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ ماس اس پر وادری داری جاری تھی۔ سسرال میں سسرال میں سینہ بان کر رہنے لگا۔ کیونکہ بھری عدالت میں اس کے بیٹے پر جو شرمناک الزام لگایا گیا تھا، اس الزام کو اس بچے نے غلط ثابت کر دیا تھا۔ ہماری دنیا میں ایسے قماشے ہوتے رہتے ہیں جیسا کہ وہ بچہ غضب کے منہ پر چلی کالک تھا اور راجیش کے منہ سے جھوٹی کالک دھو رہا تھا۔ عجیب جبرت کا مقام ہے یہ دنیا۔

پرتی نے اگرچہ شعوری طور پر بچے کو اپنے تحت الشعور کی قبر میں دفن کر دیا۔ تاہم بچے کو جنم دینے کے بعد اس کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی تھی کہ ایک بار وہ اپنے بچے کو دیکھ لے۔ عورت جب لمحہ لمحہ درد سیتے سیتے اور اپنی جان دیتے دیتے بچے کو جنم دیتی ہے تو چاہتی ہے کہ بچے کا باپ اس ننھے کو ہاتھوں میں لے کر چوسے۔ اس تخلیق کی تعریف کرے۔ تب وہ سب کچھ بھول جاتی ہے۔

وہ دل کو تسلی دیتی۔ ”بچے بد نصیب ہیں کہ امر جیسے بیٹے کو ہاتھوں میں نہیں لے سکتے۔“

وہ جانے کیوں بولتے وقت کانپے لگی۔ "مگر می صاحب! میرے پاس فضول باتوں کے لئے وقت نہیں ہے۔ میری مرضی کے خلاف مجھ سے باتیں کرنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔"

پتہ کہتے ہی اس نے ریسیور رکھ دیا۔ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب نیچے کی آواز نہیں آسکتی تھی لیکن پرچی کے کان بج رہے تھے۔ وہ ٹیلی فون کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے توقع تھی کہ کھنٹی پر بجے گی۔ وہ پھر بار سے مخاطب کرے گا تو۔ تو اب۔ اب کی بار وہ کیا کرے گی؟

وہ جوانی کا ردِ وائی کے متعلق سوچنے لگی۔ اسے خیال آیا کہ بہت دیر ہو چکی ہے۔
 بچے نے دوبارہ فون نہیں کیا ہے۔ شاید اچانک۔ سلسلے منقطع کرنے سے اس کی ہڈیاں ٹھیس
 پٹی ہیں۔ وہ اپنی توہین محسوس کر رہا ہو گا اور اب کبھی اسے فون نہیں کرے گا۔ وہ اپنی
 جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پہلے وہ چاہتی تھی کہ دوبارہ فون نہ آئے اور اب ادھر سے
 خاموشی تھی تو ادھر بے نام سی بے چینی شروع ہو گئی تھی۔ وہ اپنی میز کے سامنے ٹھلنے
 لگی۔

اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔ راجیش روزِ شام کو دفتر آکر اسے اپنے ساتھ گھر لے جاتا تھا اور اپنے ساتھ تو اور بچے کو بھی لاتا تھا تاکہ دن بھر کی محنتیں ہوئی مائیں اپنے بیٹے کو دفتر میں ہی پیار کر کے..... تاکہ دم ہو جائے۔ اس روز راجیش اور امرا کا انتظار نہ ہوا تو پرتی وقت سے پہلے ہی دفتر سے چلی جاتی۔ غصے کی فون کال نے اسے اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔

ہندو منٹ کے بعد ایک کار دفتر کے سامنے آکر رکی۔ راجیش پانچ بجے آیا کرتا تھا مگر آج میں منٹ پہلے آگیا۔ سب سے کار سے اتر کر دفتر میں داخل ہو رہا تھا۔ پریشان ہو گئی۔ جسے بھول جانا چاہتی تھی وہ اپنی یاد دلانے بغیر نہیں آ رہا تھا۔

اب تو سامنا کرنا ہی تھا۔ لہذا سامنا ہو گیا۔ دو دفتر کے دوسرے کمروں کو عبور کرتا ہوا پریتی کے چیمبر میں آ گیا۔ چند ساعتوں تک دونوں ایک دوسرے کے سامنے گم مسم رہے۔ پھر بچے نے کہا۔ ”میں جانتا تھا کہ تم مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کرو گی۔“

”اور آپ جبراً بات کرنے آئے ہیں۔“

”جبر کی بات نہیں ہے۔ میں ایسے حالات سے دوچار ہو رہا ہوں کہ اب ان حالات

دوسرے لمحے خیال آتا کہ وہیں نہ ملے گا کسی بچے کو جنم دیا ہو گا اور وہ بچہ تجھے
 کی گود میں کھیل رہا ہو گا۔ اس باپ کو اپنے دوسرے بچے کا خیال کبھی نہیں آئے گا۔ آہ!
 محبت رشتے اور بچے کی آرزوؤں کی جو داستان بڑے پیار سے کبھی شروع ہوئی تھی وہ کبھی
 کی ختم ہو چکی تھی۔ محبت کی آگ بالکل ہی بجھ گئی تھی۔ صرف یادوں کا دھواں اٹھ رہا تھا
 اور ایک امید کا عذاب رہ گیا تھا کہ مجھے کبھی تو اسے چھوڑ کر بچھڑائے گا۔

جو امید نہ آئے وہ عذاب بن جاتی ہے اور ہر نئی امید کے ساتھ وہ اپنے عذاب کو قائم رکھتی ہے۔ بچے اب اس شرم میں نہیں رہتا تھا۔ حالانکہ وہیں اس کی کوٹھی دوسری جائیداد اور کاروبار موجود تھے مگر وہ سرکاری طور پر دہلی شرم میں ٹرلا اور اپنے بچے کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ اب اس بات کا امکان بھی نہیں تھا کہ ایک شرم میں رہنے سے کبھی نہ کبھی اتفاقاً کہیں سامنا ہو جائے لیکن پریتی کے دل میں اس سے سامنا کرنے کی آرزو ایسی شدید نہیں تھی۔ بس ایک ہی تمنا تھی وہ ایک بار اپنے بچے کو اسے دکھانا چاہتی تھی۔

اس کا بیٹا امر ایک برس کا ہو گیا۔ اب وہ کیس لینے اور عدالت میں جانے لگی تھی۔ روز اپنے دفتر میں بیٹھ کر اپنے منوکلوں سے باتیں کرتی تھی۔ راجیش نے بلا آخر اسے جیت لیا تھا اور وہ دونوں میاں بیوی بڑی خوش گوار زندگی گزار رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے پرہی بلا اور نجی کمپنی کی داستان عشق کی کتاب بند ہو کر تازہ ہوئے وقت کے طالبے پر گرد آلود ہو گئی ہے اور اب آنے والا وقت بھی اس کتاب کو کھول کر نہیں پڑھے گا۔

ایک روز وہ دفتر میں بیٹھی ایک فائل کا مطالعہ کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ فون کی گھنٹی تو روز ہی گئی مگر بار بجتی تھی پرتی دن میں کتنے ہی لوگوں سے فون پر باتیں کرتی تھی۔ اسے اب کسی اہم کل کا انتظار نہیں رہتا تھا۔ اس نے فائل پر نظر مرکوز کئے ایک ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا اور کان سے لگا کر پہلو کیا۔ جواب میں بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ”پرتی!“

وہ ایک دم سے چونک کر سیدھی بیٹھ گئی۔ محبت کبھی کبھی چابک کی طرح لگتی ہے اور سیدھا بخار دیتی ہے۔ وہ اس آواز کو بے ہوشی کے عالم میں بھی پہچان سکتی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میں وعدہ کے خلاف تمہیں مخاطب کر رہا ہوں۔ ریسیور نہ رکھنا۔ پہلے میری بات سن لو۔"

وہ تھکے ہوئے انداز میں بیٹھ گیا۔ ”تم سمجھتی ہوگی کہ میں صرف نرملہ کے لئے اسے لینے آیا ہوں۔ یقین کرنا جب سے نرملہ کی طرف سے بے اولاد ہونے کا یقین ہوا ہے تب سے تمہارا بیٹا میرا بیٹا خیالوں میں آکر مجھے تڑپاتا ہے۔ اب میری یہی اولاد ہے اور میں ایسا بد نصیب باپ ہوں کہ اسے دنیا کے سامنے اپنی اولاد نہیں کہہ سکتا۔“

وہ احتجاجاً میز لہجے میں بولا۔ ”میں ایک ایسا موقع ہے کہ میں اسے نرملہ کی گود میں دے کر دنیا والوں کے سامنے اپنا بیٹا کہہ سکتا ہوں۔“

”اور میں کبھی سب کے سامنے اسے اپنا نہیں کہہ سکوں گی۔“

”تم سب سے چھپ کر روز میرے گھر آکر بچے کو پیار کر سکتی ہو۔“

”آپ نے اسی بچے کو کبھی چھپ کر بھی اپنانے کی بات نہیں کی تھی۔ جو چوری آپ نہ کر سکتے۔ وہ مجھے نہ سکھائیں۔ جب اس بچے کو ایک باپ کی ضرورت تھی اس وقت میں آپ کی بڑی سے بڑی بات مان لیتی لیکن اب میں اپنے لال پر آپ کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔ بہتر ہے کہ آپ اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کریں۔ آخری سانس تک میں اپنے بیٹے کو اپنے سے دور نہیں کروں گی۔“

بچے کا سر جھک گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں اس وقت ایسا بھکاری ہوں جس کے پاس بھیک مانگنے کے لئے مٹاڑ کرنے والے الفاظ بھی نہیں ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ایسا کیا کر گزروں کہ تم ایک دم سے پکھل کر بیٹے کو میری گود میں دے دو۔ بس اب بھگوان سے تمہارا دل سوم ہو جانے کی دعا کرتا ہوں۔“

”میں نے بھی ایک عرصہ تک آپ کے سوم ہو جانے کی دعائیں مانگی ہیں۔ کیا یہ کہنے کی ضرورت رہ گئی ہے کہ میری دعاؤں کے جواب میں آپ میرے لئے گلی بننے رہے۔“

بچے نے دروازے پر پہنچ کر اسے دیکھ کر پھر سر ہلا کر کہل۔ ”ہاں میری سگدلی یا لاپرواہی اب میری سمجھ میں آرہی ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے جیسے آخری بار احتجاجاً میز نظروں سے دیکھا لیکن پرچی نے منہ پھیر

لیا۔ وہ چیمبر سے باہر آگیا مگر دوسرے کمرے سے گزرتے وقت ٹھٹک گیا۔ وہاں راجیش بچے کو گود میں لئے کھڑا تھا۔ بچے کو دیکھ کر یکبارگی بچے کا دل بیٹے میں اچھٹنے لگا جیسے لپک کر اس ننھے کو لے لینا چاہتا ہو۔ وہی تو ایک بیٹا رہ گیا تھا۔

امرو دیرس کا ہو گیا تھا۔ بچے اسے دیکھ کر جیسے اپنے بچپن کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ آج بھی اہم میں اس کے بچپن کی تصویریں موجود تھیں۔ امر ہو ہو دیا ہی تھا۔ راجیش نے مسکرا کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”ہیلو مگرٹی صاحب! میرے بیٹے کو اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟“

بچے نے چونک کر بڑھتے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر پھر مصافحہ کرتے ہوئے کہل۔ ”بیٹا بہت خوبصورت ہے۔ اسے گود میں لے کر پیار کرنے کو ملنی چاہتا ہے۔“

راجیش نے خوش دلی سے کہل۔ ”آپ ہی کا ہے۔ ضرور گود میں لے کر پیار کریں۔“

اس نے امر کو بچے کی طرف بڑھایا۔ بچے نے اسے گود میں لینے کے لئے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ اسی وقت پرچی چپٹی ہوئی بولی۔ ”نہیں نہیں۔“ وہ دوڑتی ہوئی آئی۔ ”یہ میرا ہے۔ یہ میرا ہے۔“ اس نے بچے کے ہاتھوں میں پہنچنے والے امر کو چھین لیا۔ پھر وہاں سے بھاگ کر وہاں اپنے چیمبر کے دروازے پر آئی۔ کسے ہوئے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں نہیں دہلاؤں گی۔ میں اپنے بچے کو نہیں دوں گی۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ جاؤ۔ جاؤ۔“

اس کی چیخیں سن کر دفتر کے دوسرے لوگ اس کمرے میں آگئے تھے۔ پرچی کی اس اضطرابی حرکت سے بچے کو کھلا گیا تھا۔ دوسروں کی سوالیہ..... نظروں سے گھبرا کر تیزی سے باہر چلا گیا۔ راجیش نے ہاتھ جھٹک کر دفتر کے ملازموں سے کہل۔ ”پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم لوگ جاؤ۔ جاؤ۔ بھیڑ نہ لگاؤ۔“

وہ سب حکم کے بندے تھے۔ اپنے اپنے طور پر سوچتے ہوئے چلے گئے۔ راجیش نے پرچی کے قریب آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہل۔ ”اپنے ہوش و حواس میں رہو تم نے تو امر کو ایسے چھین لیا جیسے مگرٹی صاحب اسے لے کر بھاگنے والے ہوں۔ پھر اسے بہت شرمندہ ہو کر گئے تھے۔“

بھرے گا تو ہم اس کے بارل ہونے تک روز امر کو اتنی دیر وہاں رکھیں گے جتنی دیر تم اپنے دفتر اور عدالت میں مصروف رہتی ہو۔ فرصت کے وقت تمہارا بیٹا تمہارے ہی پاس رہا کرے گا۔

”نہیں راجیش نہیں۔ میں مصروف رہا کرتی ہوں۔ وہاں امر کو زیادہ پیار ملے گا اور وہ اسے بھلائیں گے پھلائیں گے تو وہ انہی کا ہو کر رہ جائے گا۔“

”تم ماں ہو تمہارے دل میں ہزاروں خدشات جنم لیں گے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ امر ان کی طرف زیادہ مائل ہو گا تو ہم اسے وہاں نہیں لے جائیں گے۔ بلکہ کچھ دنوں کے بعد ہی کبھی صاحب کو مشورہ دیں گے کہ کسی سچے خاندان سے کوئی بچہ گود لے لیں۔“

”میں آج ہی انہیں یہ مشورہ دے دوں گی۔ چلے میں تیار ہوں۔“

پرتی نے ایک ہاتھ سے بچے کو سنبھالا۔ دوسرے ہاتھ میں پرس لیا۔ پھر راجیش کے ساتھ باہر آکر کار میں بیٹھ گئی۔ تمام راستے وہ امر کو سینے سے لگائے رہی۔ کوئی ایسا بھلا نہ سوچتی رہی کہ راستہ بدل کر اپنے بیٹے کے ساتھ اپنے گھر پہنچ جائے۔ نرملہ کی طرف نہ جانے کی کوئی معقول وجہ پیدا ہو جائے لیکن ان کی کار بچے کی کوٹھی کے احاطہ میں پہنچ گئی۔ بچے ابھی تک گھر واپس نہیں پہنچا تھا۔ شاید غم غلط کرنے کے لئے کہیں بار میں بیٹھ کر بی رہا ہو گا۔ پرتی نے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر راجیش کو وہاں بیٹھنے کے لئے کہا اور امر کو گود میں لئے نرملہ کی خواب گاہ میں گئی۔ وہاں روتے کی کچھ عورتیں تھیں۔ نرملہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ پرتی اور بچے کو دیکھ کر اٹھنے لگی وہ بہت بیمار تھی اس میں اٹھنے کی بھی سکت نہ تھی۔ پرتی نے قریب جاتے ہوئے کہا۔ ”آپ آرام سے لیٹی رہیں۔ میں اپنے بیٹے کو خود مل لاری ہوں۔“

نرملہ نے کہا۔ ”نہیں۔ یہ..... یہ میرا بیٹا ہے۔ تم اسے کہاں لے گئی تھیں؟“

پرتی ٹھٹک گئی۔ پہلے تو جی میں آیا کہ اپنے بیٹے کو لے کر واپس بھاگ جائے۔ پھر خیال آیا کہ نرملہ متا کی ماری ہے۔ اپنے حواس میں نہیں رہتی ہے۔ اسے بچے کی صورت دکھا کر واپس نہیں لے جانا چاہئے۔ پرتی کو سوچ میں دیکھ کر نرملہ نے نقاہت سے کہا۔ ”آؤ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں دوسرے بچوں کو اپنا کہہ کر ان کی ماؤں کو پریشان کر دیتی

وہ اطمینان کی گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”اچھا ہے پھر کبھی نہیں آئیں گے۔“

وہ پلٹ کر چیمبر میں آگئی۔ اپنے بیٹے کو جی بھر کر چومنے لگی۔ راجیش نے کہا۔ ”ہر شخص اپنے حالات سے مجبور ہوتا ہے۔ مجھے کمرٹی کی دھرم جتنی سے ہمدردی ہے۔“

پرتی نے چونک کر دیکھا۔ تب اسے خیال آیا کہ بہت دیر پہلے ہی راجیش کے یہاں آنے کا وقت ہو چکا تھا اور وہ بہت دیر پہلے ہی امر کو لے کر یہاں پہنچ گیا تھا اور بچے کے ساتھ ہونے والی تمام گفتگو سن لی تھی اور اس طرح اس نے اپنے بیٹے امر کے باپ کو پہچان لیا تھا۔

راجیش نے اس کے چونکنے کے انداز کو سمجھتے ہوئے کہا۔ ”امر صرف میرا بیٹا ہے اور اسے ہم سے کوئی چھین کر نہیں لے جاسکے گا۔“

وہ راجیش سے پلٹ گئی۔ ”تم کتنے اچھے ہو۔ تم محافظ نہ بننے تو نہ جانے میرا انجام کیا ہو گا؟“

”ہمارا انجام بخیر ہو گا۔ ہمیں اپنے آپ پر اعتماد رکھنا چاہئے۔“

”مجھے اپنے سے زیادہ آپ پر اعتماد ہے۔“

”تو پھر امر کو نرملہ دیوی کے پاس لے جاؤ۔“

وہ ایک جھٹکے سے الگ ہو کر بولی۔ ”نہیں وہاں کبھی نہیں لے جاؤں گی۔“

”تم کتنی ہو کہ اپنے بیٹے کو بہت بڑا آدمی بناؤ گی۔ اس سے بڑا پن اور کیا ہو گا کہ امر اتنی ہی عمر میں ایک نیم پاگل عورت کو تنہی زندگی دے گا۔“

وہ جھج کر بولی۔ ”کیا تم میرے بچے کو مجھ سے چھین کر سوتیلے باپ ہونے کا ثبوت دے رہے ہو؟“

”نہیں پرتی! میں امر کو بیش کے لئے اپنے سے الگ نہیں کر سکتی۔ اگر میں نے ایسا کیا تو اپنے ہی باپ کو کیا جواب دوں گا۔ وہ اپنے پوتے کا مطالبہ کریں گے۔“

تب پرتی کو خیال آیا کہ امر صرف اسی کا نہیں بلکہ پورے خاندان کا لاڈلا ہے اور کوئی اسے نرملہ کی گود میں دینا منظور نہیں کرے گا۔ اس نے پوچھا۔ ”پھر تم اسے نرملہ کے پاس کیوں پہنچانا چاہتے ہو؟“

”ہم خود اسے لے جائیں گے۔ وہاں دیکھیں گے۔ اگر اس عورت کی متا کا زخم

ہوں۔ پریتی! میں پاگل نہیں ہوں۔ مگر پتہ نہیں کیسے میں آپ ہی آپ بکواس کرنے لگتی ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ یہ بچہ تمہارا ہی ہے۔“

پریتی نے فوراً ہی مطمئن ہو کر اپنے بیٹے کو اس کے پاس پٹنگ پر بٹھا دیا۔ نرملہ نے امر کو ادھر ادھر سے چھو کر دیکھا جیسے اس میں اپنے شوہر کو دیکھ رہی ہو۔ پھر وہ اسے ٹھہر ٹھہر کر چومنے اور اس کی تعریف کرنے لگی۔ اسنے میں بچے آگیا۔ وہ خوش ہو کر بچے کو نرملہ کے پاس دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ قریب آکر احسان مندی سے بولا۔ ”پریتی! میں کس زبان سے تمہارا شکر یہ ادا کروں؟“

نرملہ نے کنوڑی آواز میں کہا۔ ”سب لوگوں کو یہاں سے جانے کے لئے کہہ دیں۔ میں پریتی سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“

بچے نے تمام رشتہ داروں کو خواب گاہ سے باہر جانے کے لئے کہا۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو نرملہ نے بچے سے کہا۔ ”آپ بچے کو گود میں لے کر وہاں میرے سامنے کھڑے ہو جائیں۔ پریتی تم بچے کے ساتھ کھڑی ہو جاؤ۔ جلدی کرو۔“

بچے نے بچے کو گود میں لیا۔ پھر پٹنگ کی پانٹنی جاکر نرملہ کی نگاہوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پریتی بھی جھجکتی ہوئی بچے کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ نرملہ نے ایک گہری سانس چھوڑ کر کہا۔ ”ایک وقت آپ مجھے طلاق دینا چاہتے تھے۔ اب بھی میں ملنا نہیں بن سکتی۔ پریتی میں تم سے..... التجا کرتی ہوں کہ بچے کو اس بچے سے محروم نہ کرنا۔ تم چاہو تو طلاق لے کر بچے سے شادی کر سکتی ہو میں..... میں اپنی زندگی سے طلاق لے کر جا رہی ہوں۔“

”نرملہ! ایسا نہ کہو۔ یہ بچہ صرف ہمارا نہیں تمہارا بھی ہے۔ تم زندہ رہو گی اور یہ بچہ تمہاری گود میں پروان چڑھے گا۔“

پریتی نے کہا۔ ”نرملہ دیوی! آپ عورت ہونے کے ناتے سمجھ سکتی ہیں کہ میں خواہ مخواہ راجیش سے طلاق نہیں لوں گی۔ آپ میری خاطر اپنے شوہر کو چھوڑ سکتی ہیں تو میں آپ کی خاطر اپنے بیٹے کو آپ کے پاس چھوڑ سکتی ہوں۔ دنیا میں اگر بہت کچھ سنا پڑتا ہے۔ آپ زندگی کو ہارنے کی بات نہ کریں۔“

نرملہ کی آنکھیں بچے اور امر کو دیکھتے دیکھتے ساکت ہو گئیں۔ پریتی نے اسے آواز

دی۔ ”دیوی جی! امر آپ ہی کو ماں کہے گا آپ اسے آواز دیں۔ یہ گود میں آجائے گا۔“ بچے نے پوچھا۔ ”نرملہ چپ کیوں ہو؟ امر کو آواز دو۔“

دونوں باری باری نرملہ کو پکارتے رہے۔ پھر بچے امر کو پریتی کی گود میں دے کر اس کے پاس پہنچا۔ تب پتہ چلا کہ وہ اپنے ہاتھ مقدور پر تھوک کر اس دنیا سے جا چکی ہے۔ بچے نے سراٹھا کر کہا۔ ”نرملہ..... نرملہ نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے پریتی۔“

پریتی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے اپنے بیٹے کو اپنے سینے کے ساتھ زور سے بچھنچھنچ لیا۔ پھر سر جھکا کر وہاں سے پلٹ کر آہستہ آہستہ خواب گاہ سے باہر چلی گئی۔

☆-----☆-----☆

بچے کئی ماہ تک سوگ مناتا رہا۔ نرملہ سے سترہ سال تک رفاقت رہی تھی۔ وہ سوگ نہ منا کر دوسری شادی کی فکر کرتا..... تو برادری والے براہ راست۔ پھر سیاست میں بھی کچھ یوں الجھتا پڑ گیا کہ مصروفیات میں ایک برس بیت گیا۔ تاہم اس نے ایک برس میں چار مرتبہ پریتی سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ دوبارہ وہ فون اٹینڈ کرنے کے لئے موجود نہیں تھی۔ تیسری بار اس نے اٹینڈ کیا تو بچے نے کہا۔ ”پریتی! میں شادی کے بندھن سے آزاد ہو گیا ہوں۔ اب میرے آگے پابندیاں نہیں ہیں۔“

وہ بولی۔ ”میں شادی کے بندھن میں ہوں۔ میرے آگے پابندیاں ہی پابندیاں ہیں۔“

چوتھی بار اس نے فون پر کہا۔ ”پریتی! یاد کرو نرملہ کی آخری خواہش کیا تھی؟ وہ مجھے اور تمہیں اور امر کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتی تھی اب بھی اس کی آتما (روح) ہمیں ساتھ دیکھنے کے لئے بے تاب ہو گی۔“

”بچے! زندہ لوگوں کی آتمائیں بھی بے چین ہوتی ہیں۔ اگر ان سے بے وفائی کی جائے۔ میں راجیش کی جیتی جاگتی دنیا میں رہتی ہوں۔ کسی سے بے وفائی میرا شیوہ نہیں ہے۔“

اس نے ریموڈ رکھ دیا۔ پھر ایک دن راجیش نے بتایا کہ بچے سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے رات کو کھانے کی دعوت دی ہے۔ پریتی نے کہا۔ ”میں تو نہیں جاؤں گی۔“

کہہ رہا ہوں۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔ میں نے اس بچے کا باپ بن کر پرتی کے ساتھ جو نیکی کی ہے اسے دنیا نہیں سمجھے گی۔ اسے میری بے غیرتی اور نامردی سمجھے گی۔ پھر ایک بار میرے چاروں طرف بدنامی کے دروازے کھل جائیں گے۔ بے شک میں بھی مجبور اور بزدل ہوں۔"

کسی دنیا ہے یہ؟ بزدلوں سے بھری پڑی ہے۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ بچ کو جک کہہ سکے۔ پرتی کے دائیں طرف راجیش کھڑا تھا اور بائیں طرف بچے کمرتی تھا۔ امر ایک کا بیٹا نہیں تھا مگر وہ اسے بیٹا کہتے پر مجبور تھا۔ امر دوسرے کا بیٹا تھا۔ مگر وہ باپ کے رشتے سے انکار کرنے پر مجبور تھا۔ مذہب لوگوں کے درمیان مجبوریوں کے رشتے زیادہ ہوتے ہیں۔

پرتی نے دونوں کے درمیان کھڑے ہو کر کہا۔ "اگر اسی طرح انسان حالات کا غلام ہوتا ہے تو آپ دونوں غلام میرے لئے برابر ہیں۔ میں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دے سکتی۔ مجھے تو اسی خاندان میں رہنا ہے، جہاں میں اب رہتی ہوں۔ دیے آپ دونوں کو فیصلہ کرنا چاہئے کہ میرے بچے کے سلسلے میں کون سینہ ٹھونک کر جک کہہ سکتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ دونوں کے درمیان سے نکل کر جانے لگی۔ دروازے پر پہنچ کر وہ ذرا ٹھہر گئی۔ دونوں کی طرف دیکھ کر بولی۔ "سراج میں خود کو معزز اور جائز بنا کر رکھنے کے لئے ایک ننھے سے بچے کو ناجائز کہہ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ آپ لوگوں کے پاس ذرا اسی بھی عقل ہے تو جک کو پہچانیں اور جک یہ ہے کہ میرا بچہ جائز ہے اور آپ دونوں کی تہذیب ناجائز ہے۔"

وہ پلٹ کر جانے لگی۔ راجیش نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "رک جاؤ پرتی! اگر تم بیچنے کے انداز میں بولو گی تو میں پھر بدنامی مول لے کر تمہیں اور امر کو چھوڑ سکتا ہوں۔" بچے نے کہا۔ "تم چھوڑو۔ میں پرتی کو اپنالوں گا۔"

وہ بولی۔ "اونہ نہ تم مجھے چھوڑ سکتے ہو اور نہ بچے اب مجھے اپنا سکتے ہیں کیونکہ آپ دونوں حالات سے مجبور ہو جاتے ہیں اور اب حالات یہ ہیں کہ میں راجیش کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

راجیش دھپ سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر خوشی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اب اس کا بچہ جنم لینے والا تھا۔

بچے صوفے پر گرا اور اس میں دھنس کر رہ گیا۔ اب اگر وہ پرتی کو اپنانے کی بات کرتا تو پرتی کے ساتھ دوسرے کا بچہ اس کے گھر پیدا ہوتا۔ جیسے اس کا بچہ دوسرے کے گھر ہوا تھا۔

ان سب کے بچوں میں پھر حالات کی زنجیریں پڑ گئی تھیں۔

☆-----☆-----☆